مدیر: علی محمد فرشی
سمبل

مدیر: علی محمد فرشی

(شناختِ خاص: بورخیس)

جنوری تا جون ۲۰۰۸ء

جلد:۲ شمارہ:۳/۴

قیمت فی شمارہ:۷۵روپے قیمت موجودہ شمارہ:۱۸۰روپے

رانی مارکیٹ، ٹینچ بھاٹا، راول پنڈی کینٹ، پاکستان

سمبل

تزئین: سلیم پاشا

خطاطی: رحیم شاہ

حروف بنی: صابر خاکی

زر سالانہ:

اندرون ملک: عام ڈاک سے: ۳۰۰ روپے، رجسٹرڈ رکوریئر سے: ۴۰۰ روپے

بھارت: ۶۰۰ روپے، یورپ رامریکا رمشرق وسطی: ۱۳۰ امریکی ڈالر

ذرائع ترسیل زر:

منی آرڈر رچیک (جو راول پنڈی راسلام آباد کے بنک سے کیش ہو سکے) بنام سہ ماہی 'سمبل'

ضابطہ:

سمبل میں شائع شدہ کسی بھی تحریر اور اس کے مصنف سے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ (ادارہ)

سمبل میں شائع شدہ تحریروں کو علمی مقاصد کے لیے بغیر اجازت کسی بھی کتاب، رسالے یا ویب سائٹ میں حوالے کے ساتھ دوبارہ شائع کیا جا سکتا ہے۔ (ادارہ)

رابطہ:

ای میل: symlit@yahoo.com alimfashi@yahoo.com

سیل فون: 0300-5582082

خط کتابت رترسیل زر: رانی مارکیٹ، مینج بھاٹا، راول پنڈی کینٹ

ناشر:

علی محمد

طابع:

الف۔ آئی پرنٹرز، خورشید پلازا، کشمیر روڈ، صدر، راول پنڈی

ترتیب

بورخیس کی روشن دنیا

علی تنہا

خورخے لوئیس بورخیس دنیا کے ان عظیم ادیبوں میں سے ہیں جن کی بصارت ختم ہوئی تو ان کے اندر کی دنیا نے پورے عالم کو جگمگا دیا۔ ان مشاہیر میں ہومر، ملٹن عربی کے کلاسیکل شاعر ابونواس، مصر کے نوبل انعام یافتہ ادیب نجیب محفوظ اور بورخیس شامل ہیں۔

بورخیس کو خدا نے پیمبرانہ صلاحیتوں سے نوازا۔ اس نے اپنے افسانوں اور حکایات میں دیو مالا، تماثیل اور اساطیر کو اس طرح گھلا دیا ہے کہ اس کے قلم کو چھوتے ہی لفظ سونا بن جاتے ہیں۔ یہ لفظ اس کے ہاں بصیرت اور انسانی تجربات کی بنا پر ہماری ذہنی توسیع کرتے ہیں، مگر خیال کو سونے کا ٹھوس پن بنانے میں اس نے اپنی ذات کو مدتوں آگ میں جلایا اور توازن کی ایسی تہذیب کی کہ آج کے ہسپانوی ادیب و شاعر کی عظمت درجۂ کمال پہ قائم ہے۔ ہسپانوی ادبیات کے اس عظیم اہل قلم نے ارجنٹینا کے شہر بیونس ایریز میں اگست ۱۸۹۹ء میں جنم لیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ مادرزاد لکھاری تھا تو غلط نہ ہوگا کیوں کہ اس نے محض چھ برس کی عمر میں لکھنا شروع کیا اور نو برس کی عمر میں آسکر وائلڈ کے ایک افسانے کا ترجمہ کر کے بیونس ایریز کے ایک اخبار میں شائع کیا۔ وہ بے انت پڑھنے والا شخص تھا اور مشرق و مغرب کی متعدد زبانیں پوری صحت کے ساتھ جانتا تھا اس کا حافظہ قابل رشک بل کہ ناقابل یقین حد تک اتھاہ اور زبردست تھا۔

بورخیس نے ابتدائی عمر میں اپنے والد کے کتب خانے کی بے شمار کتابوں کو پڑھ ڈالا اور اس زمانے میں جب کھیل کود کی لپک بچے کو ٹکنے نہیں دیتی، بورخیس نے مطالعہ میں عمر کا بہترین حصہ صرف کر دیا اوائل عمری میں مغرب کے ساتھ ساتھ انگریزی میں اس نے رچرڈ برٹن کی ترجمہ کردہ الف لیلہ کی ضخیم جلدوں کو

چاٹ ڈالا اور یوں مشرق کے عظیم تہذیبی وادبی رچاؤ سے متعارف ہوا۔ شروع میں وہ والٹ وٹمن سے شاعری میں اور فکشن میں کافکا، جوئیس، ایڈگر ایلن پو سے متاثر رہا بلکہ کافکا کے فن کی عظمت کا تو معترف آخری دم تک رہا۔

جب بورخیس نابینا ہوگیا تو اس کے اندر جرأت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا اسے بصارت کے خاتمے پر ملٹن سے بہت ہمت ملی۔ خود بورخیس نے لکھا ہے کہ ملٹن اپنے عالم گیر رزمیہ ''جنت گم گشتہ'' (Paradise Lost) کے چالیس چالیس مصرعے یاد کر کے لکھواتا اور ایک لفظ کے تغیر وتبدل پر بھی چیخ اٹھتا نابینا ہونے کے بعد ملٹن کا حافظہ مزید براق ہوگیا تھا۔

ہسپانوی زبان کی ثروت کا جورنگ خورخے لوئیس بورخیس نے اپنے فن کے ذریعے بکھیرا اس میں انسانی تجربے اور آدم کے ہزار ہا سالہ حافظے کی بازگشت کی تصویریں دیکھنا ممکن ہے۔ وہ قدیم، دیومالا کو اپنے فن میں اس طرح سمولایا کہ اس کے آرٹ کی پرتوں میں ہمہ گیریت پیدا ہوئی۔ ابتدا میں اس نے حیران کن افسانے رقم کیے مگر ایک نابغہ ہونے کی وجہ سے اس پر بہت جلد کھل گیا کہ یہ کام تو ہر دوسرے درجے کا مصنف کرسکتا ہے کیوں کہ چونکا دینے والے فکشن کی چمک لحاتی ہوتی ہے اس کا پہلا افسانہ ۱۹۳۵ء میں A Universal History Infamy کے نام سے نکلا، اس مجموعے میں افسانوں کے علاوہ حکایات بھی ہیں جن میں یہودیت، عیسائیت حتیٰ کہ مسلمانوں کے عظیم حکایاتی ادب کو خورخے لوئیس بورخیس نے پیش کیا، مگر ان میں ان کا بیانیہ تخیلی، گہرا اور تہ دار ہے اس کے اسلوب میں پیچ دار فقروں نزاکت اور معنویت نمایاں ہے۔ حد یہ کہ بورخیس نے ابن رشد کو کردار بنا کر اس کے مرکزی نظام فکر کو افسانوی روپ میں پرودیا۔ وہ حضرت فریدالدین عطار سے بھی متاثر رہا۔ مشرق میں اس نے بچپن میں قدم رکھا اور الف لیلہ کی ضخیم جلدوں کو روح میں اتار لیا اور پھر مشرق کی عظیم روایات کو ایک نئی بصیرت کے ساتھ تخلیق کیا۔

بورخیس کی نثر انسانی بصیرت کے ہزار ہا سالہ تہذیبی، اساطیری ابعاد کی شارح ہے وہ طویل فقرے لکھتا ہے تاکہ وہ انسانی تجربوں کو اس کی ضرورت اور توانائی کے مطابق ڈھال سکے پیچیدہ انسانی نفسیات اور مابعدالطبیعیات کے لیے اس نے لسانی شیوہ بھی وہی رکھا جس کا تقاضا اس کا موضوع کرتا تھا۔ اس کے افسانوں میں حتیٰ کہ نظموں میں بھی علامات کا نظام لہریں لیتا ہوا کائنات کے مظاہر کو لامحدود زمانی بے نوراما

میں دکھاتا ہے۔

بورخیس کو پڑھنے کے لیے قاری کو اپنی سطح بلند کرنی پڑتی ہے۔ یا یوں کہیے کہ وہ اپنی خرد افروزی کی روشنی سے عمومیت کو تہس نہس کر کے انسانی تجربے کی توسیع کرتا ہے۔ اس نے اس باب میں جیمس جوائس اور کافکا سے فیض پانے کے بارے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا بل کہ کافکا سے اعترافِ فن کے باب میں کافکا کے پیش رو کے عنوان سے ایک یادگار مقالہ بھی لکھا اور جوانی میں کافکا کے شاہ کار "The Great Wall of China" کا ترجمہ بھی کیا۔

بورخیس کے مشہور افسانوں میں "گول کھنڈ" "بابل میں لاٹری" "زخم کا ہلال" "خدائی ہاتھ کی تحریر" "زرد گلاب" "بدت اور قطب نما" "مایا کے روپ" جیسے بے شمار فکر انگیز افسانے اور حکایات شامل ہیں۔ انگریزی میں اس کا پہلا مجموعہ ۱۹۵۸ء میں The Garden of Forking Patch اور ۱۹۶۲ء میں مشہور کتاب "فیکشنز" طبع ہو کر علمی ادب میں تہلکہ خیز ثابت ہوئی۔ اسی طرح ۱۹۶۴ء میں Dream Tigers اور حکایات کی کتاب Labyrinth نے بھی بے پناہ شہرت حاصل کی۔ تعجب کی بات ہے چند سال پہلے گبریئل مارکیز کا ناول بھی اسی نام سے شائع ہوا مگر اس نے فکشن کی دنیا میں تحرک پیدا نہ کیا جو مارکیز کا حصہ ہے۔

۱۹۷۱ء میں افسانوں اور حکایتوں پر مشتمل کتاب Aleph and Other Storise بھی ایک نیا افسانوی حسن لے کر طلوع ہوئی۔ اس کی نظموں اور تنقیدی مضامین کے کثیر مجموعے اب تک عالم گیر ادبی مباحث کا باعث بنے ہیں پھر اس کے فکر انگیز تنقیدی مضامین On the Classic کو کون بھول سکتا ہے۔

۱۹۳۳ء میں بورخیس نے اخبار کے لیے کالم بھی لکھے اور یوں دنیا بھر کے قارئین کو بتایا کہ انسانی بصیرت میں ڈکٹیٹر شپ اور ظلم کے خلاف جہاد کے لیے جگہ بنائی جائے۔ اس کے کالموں میں بھی اپنے اسلوبیاتی رس اور بات کہنے کے مشکل قرینے کو چھپایا نہیں۔ بورخیس کی شہرت جب پھیلنا شروع ہوئی تو اس نے سچ سچ کر نہایت نیاز مندی سے عالمی ادب کو نئی صدی میں رہ کر اپنے ماضی سے جوڑ دیا تا کہ انسانی اعمال کا تماشا قوتِ متخیلہ کی مدد سے ایسے اسباب پیدا کرے کہ لوگوں میں تبدیلی کی آواز جنم لے سکے۔

بورخیس نے نہایت نادر اور حیرت افزا استعاروں اور علامات کے پردے میں افسانوں کو بسیط اور

عمیق تجربے کی گزرگاہ بنایا جس میں سے گزرتے وقت آدمی ان آہٹوں کو سن سکتا ہے جن کے عقب میں حیات انسانی کے اسرار کا گیت چھن چھن کر ذہن پر مرتسم ہوتا ہے۔اس کے ہاں لفظ ماورائی طاقت سے بھر جاتے ہیں اور وہ افعال کو اس طرح جست دیتا ہے کہ لفظ سانس لینے لگتے ہیں کیوں کہ اس پر یہ راز فاش ہو گیا تھا کہ تمثیلوں میں موجودات کی کس درجہ عصری روح داخل ہو کر لافانی ہو سکتی ہے۔

دوسری جنگ عظیم میں بورخیس حکومت وقت کے غیض کا نشانہ بنا۔۱۹۴۶ء میں جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد اسے نوکری سے ہاتھ دھونے پڑے مگر بورخیس نے کسی طور پر سمجھوتا نہ کیا حتیٰ کہ ارجنٹینا میں پیرون کی ڈکٹیٹر شپ کے بعد اسے ارجنٹینا کی قومی لائبریری کا ڈائریکٹر مقرر کر دیا گیا جہاں وہ تا حیات کام کرتا رہا۔۱۹۶۲ء میں بورخیس کو لاس اینجلس یونی ورسٹی نے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری دی۔۱۹۶۱ء میں اسے Formentor Prize (دس ہزار ڈالر) کا انعام ملا۔۱۹۷۱ء میں اسے امریکن اکیڈمی آف لٹریچر نے اعزازی ممبر شپ دی غرض اسے دنیا بھر میں بے شمار اعزازت سے نوازا گیا۔مگر اس نے دنیاوی اعزازت کو پر کاہ برابر اہمیت نہ دی۔اگر چہ وہ مذاہب پر یقین نہ رکھنے والا شخص تھا،لیکن اسے معلوم تھا کہ یہ جاہ و منصب سب فریب ہیں۔اس کے اندر بہ یک وقت ایک مفکر اور صوفی کی روح موجود رہی۔اس نے Fables کو ایک نئی توانائی سے آشنا کیا۔اس کی رس بھری ہوئی جزئیات اور مرصع کاری ایسی مثال ہے جسے بورخیس کے علاوہ دوسرا ادیب خلق کرنے کی جرأت ہی نہیں کر سکتا۔کیوں کہ بعض اوقات پلاٹ اور تیکنیک کے برتاؤ میں وہ ریاضیاتی وضع کی نثر سامنے لایا ہے جس کی اوضاع تخلیق کرنے کے لیے غیر معمولی ہنر کی قدرتی بل کہ معجزاتی آورد کی ضرورت ہے

یہی وہ چیز ہے جو آرٹ میں توازن کی تشکیل کرتی ہے۔اسے رومانوی یا جذباتی سطوح سے پاک کر کے ہیئت کی تہذیب کرتی ہے۔بورخیس ۱۵ جون ۱۹۸۶ء میں اس دنیا سے رخصت ہوا تو اصل میں وہ دوبارہ اپنے فن کے طفیل ہمیشگی کی عمر پر زندہ ہو گیا۔

بورخیس۔ایک ٹیڑھا لکھاری

محمود احمد قاضی

یہ جو دنیا ہے اس میں ہم جیسے بندے بھی ہوتے ہیں جو دنیا میں آتے ہیں اور مَر جاتے ہیں کیوں کہ یہ آتے ہی مرنے کے لیے ہیں اور کچھ دوسرے ہیں جو ایک شان سے آتے ہیں، زندہ رہنے کے لیے آتے ہیں، وہ زندہ رہتے ہیں اور جب مرتے ہیں تو بھی نہیں مرتے کہ ان کا نام ان کا کام ہمیشہ کے لیے وقت کی پیشانی پر ثبت ہو جاتا ہے۔ غور کیا جائے تو وہ دیکھنے میں ہم جیسے ہی ہوتے ہیں۔ دو کان، ناک، دو آنکھیں، دو پیر، شکم کا ایک دوزخ بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ ذہن کی دولت سے بھی مالا مال ہوتے ہیں اور اس مال ہی کو وہ ساری زندگی خرچ کرتے رہتے ہیں اور یہ مال ہے کہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ یا یہی وہ موڑ ہے وہ علاقہ ہے جہاں وہ ہم جیسے نکموں سے علاحدہ قرار پاتے ہیں ان کی کیمسٹری کچھ اور ہی نکلتی ہے۔

دنیا کا جو سماجی نظام ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے، ایک عظیم قسم کا ڈراما ہے، ریچڑ ہے۔ اگر تو اسے جوں کا توں قبول کر لیا جائے تو پھر تو راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ آپ آئے آپ نے زندگی جیسے تیسے کر کے گزاری اور مر لیے۔ سب کچھ خلاص، چھٹی اور جو سوچنے لگتے ہیں اصل میں مصیبت وہ مول لیتے ہیں۔ آگاہی تو ان کے لیے عذاب بن جاتی ہے۔ وہ یہ عذاب ایک درویشانہ استغنا کے ساتھ برداشت کرتے ہیں۔ سقراط، گیلیلیو ایسی ہی کیمسٹری رکھنے والے بندے تھے۔ پھر بیسویں صدی آ گئی جگ جگ چلتے وقت کے دھارے تھکتے نہیں، اسی لیے آئن سٹائن آیا اور بورخیس نے بھی جنم لیا۔ وہ ایسے جیا کہ مر کر بھی نہیں مرا۔ وہ اب تک سب سے زیادہ دل چسپی سے پڑھا جانے والا پُرش ہے۔ کیا چیز ہے یار جناتی! ویسے تو آج کا لیونگ لیجنڈ گارسیا مارکیز بھی ایک لاطینی امریکی ہی ہے لیکن یہ بورخیس جناب اس کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ اسے لیجنڈری ورٹے، اساطیر، روایات سے پیار بھی ہے اور وہ ساتھ ہی ساتھ انھیں نیگیٹ بھی کیے جاتا ہے کہ ہونا اور نہ ہونا بھی تو اُس کا پیشن ہے۔ اُس کے کردار ہیں بھی اور نہیں بھی۔ وہ خود ہے بھی اور نہیں بھی۔ اُس کا خدا بھی کبھی تو ہے اور کبھی بالکل ہی نہیں ہوتا۔ خدا سے وہ مسلسل چھیڑ چھاڑ کیے جاتا ہے۔ اُس کے پاس ایک ہی کہانی ہے جو مختلف کہانیوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اُس کے کرداروں کے حلیے، مہاندرے، ردِعمل عمومی ہیں لیکن اتنے ہی خاص منفرد اور مختلف بھی۔ وہ ان کے ہاتھ میں ایک چاقو تھما دیتا ہے۔ وہ اس سے ایک شخص کو مار دیتے ہیں۔ اُس کی کئی کہانیاں تو شروع ہی مرے ہوئے بندوں کے بیان سے ہوتی ہیں۔ اُس کی کہانی شروع ہی تب ہوتی ہے جب کہ وہ مر چکے ہوتے۔ وہ انھیں پھر سے زندہ کرتا ہے اور ان کے ذریعے وہ مرنے سے پہلے کی اور بعض اوقات مرنے کے بعد کی کہانی بیان کرنے لگتا ہے۔ ''اُس نے اپنی موت سے پہلے یا بعد میں اپنے آپ کو خدا کے حضور پایا...'' کہانی "Every Thing and Nothing" اور جب اُس کا کوئی کردار کسی دوسرے کو مار دیتا

ہے تو بعض اوقات وہ کہتا ہے:

''اُس نے اپنے خون آلود چاقو کو گھاس پر صاف کیا اور پیچھے مُڑ کر دیکھے بغیر مکانوں کے ابھار کی طرف آہستہ سے چل دیا۔ اُس نے اپنا جائز مشن مکمل کر لیا تھا۔ وہ کوئی نہیں تھا۔ زیادہ مناسب انداز میں کہا جائے تو یہ کہ وہ ایک اجنبی بن گیا تھا۔ اس زمین پر اس کا کوئی اور مشن نہیں تھا مگر اُس نے ایک شخص کو مار دیا تھا'' (کہانی "The End")۔

دنیا میں اور بھی بہت سے لکھاری ایسے ہیں جنھوں نے ایبسـرڈٹی پہ بہت کچھ لکھا لیکن وہ ایسا کرتے ہوئے محض اور محض ایبسـرڈٹی یعنی لایعنیت کا خود بھی شکار ہو جاتے ہیں۔ بورخیس کے ہاں صورتِ حال قطعی تبدیل ہوتی نظر آتی ہے۔ وہ اس لایعنیت سے معنویت کے اکھوے کو پھوٹنے دیتا ہے۔ وہ ایک ایسا تذبذب اور شک پیچھے چھوڑ دیتا ہے کہ یقین اور بے یقینی ایک دوسرے سے یوں گلے ملتے ہیں کہ وہ حقیقت بھی بن جاتے ہیں بل کہ حقیقت سے زیادہ ایک بڑی حقیقت۔ بڑے کینوس کی حقیقت۔ یہ کام صرف بورخیس جیسا جینئس ہی کر پاتا ہے ورنہ مٹی کا ڈھیر تو مٹی کا ڈھیر ہی ہوتا ہے۔

''کچھ لوگ ہیں کہانی کو مختلف انداز سے بیان کرتے ہیں۔ دنیا میں کوئی بھی دو چیزیں ایک جیسی نہیں ہو سکتیں۔ ان کا کہنا ہے کہ شاعر کو تو محض ایک نظم پڑھنی تھی جب کہ عمل اس کے آخری الفاظ کی ادائی کے ساتھ ہی منظر سے مٹ گیا، غائب ہو گیا اور ختم ہو گیا۔ یقین مانیے، ایسے اسطورہ ادبی تخیلات سے زیادہ کچھ نہیں ہوتے۔ شاعر شہنشاہ کا غلام تھا اور وہ اِسی غلامی میں مر گیا۔ اس کی نظم اس کے لیے بھلا دی گئی کیوں کہ وہ فراموش کر دیے جانے کے ہی قابل تھی اور اُس کی نسل کے لوگ ابھی تک متلاشی ہیں لیکن وہ اس کائنات سے متعلق لفظ ڈھونڈ نہیں پائیں گے'' ۔(کہانی "Pavelile of the Palace")

''میں نہیں جانتا کہ ہم دونوں میں سے یہ صفحہ کون لکھ رہا ہے'' (کہانی "Borges and I")

زندگی جیسے زگ زیگ چلتی ہے وہ بھی ایسے ہی چلتا ہے۔ وہ سیدھا نہیں ہے اور سیدھا نہیں چلتا نہ ہمیں سیدھے سیدھے چلنے کی تلقین کرتا ہے کہ وہ تلقین شاہ بالکل نہیں ہے۔ وہ تو 'جو ہے' اس کو 'جو نہیں ہے' سے ایسے ملاتا ہے، آپس میں مدغم کرتا ہے کہ حقیقت حقیقت نہ رہتے ہوئے بس ایک اور طرح کی اصلی اور صحیح حقیقت بن جاتی ہے۔ وہ جھوٹ لکھتا ہے اور سچ کہتا ہے۔ وہ کہانیاں خود گھڑتا ہے، بناتا ہے جو کہ ایک فکشن نگار کا اصل وصف ہونا چاہیے۔ بہ شرط کہ اُس کی دنیا کوئی ماورائی دنیا نہ ہو کہ اسی دنیا سے ایک آرٹسٹ نئی دنیا میں تخلیق کر سکتا ہے۔

اگر ایک آرٹسٹ بے چین ہے، مضطرب ہے تو وہ یقیناً سچا بھی ہے۔ وہ اِریـنیـنـڈ ہے اسی لیے تو وہ ہمیں بھی اِریـنیـنـٹ کر سکتا ہے، خود متحیر ہو سکتا ہے اور دوسروں کو بھی اسی تجربے میں شامل کر سکتا ہے کہ وہ حیرت میں مبتلا ہو کر بھی حیرتی نہیں رہتے بل کہ ایک اور نئی دنیا کا دَر اُن کے سامنے وا ہو جاتا ہے۔ ایک ایسی دنیا جس کی سرحدیں پھر انھی کی دنیا سے آ ملتی ہیں اور آشنائی اور ناآشنائی کا یہ ایک مسلسل عمل ہمیں بے عملی اور دو غلے پن کا شکار نہیں ہونے دیتا۔ ہم بے چہرہ ہوتے ہوئے بھی اپنا چہرہ کھو نہیں پاتے بل کہ چہروں پر سجے مکھوٹے اترتے چلے جاتے ہیں۔ لباس تک ہمارے بدنوں سے یوں اترتے ہیں کہ اب عریانی ہی ہمارا لباس ٹھہرتی ہے۔ یہ وہ ملبوس ہے جو مستقل ہے پائے دار ہے کیوں کہ اصل اصل ہے اور نقل نقل۔

بورخیس ایک ٹیڑھا لکھاری ہے اور متنازع بھی اور یہی چیز اُسے دوسروں سے ممتاز کر جاتی ہے۔ وہ گول گپتا 'ہرگز نہیں۔ وہ ہمیں وہ کچھ بتاتا ہے جس کے بتانے کی واقعی ضرورت رہتی ہے۔ وہ کچھ چھپا بھی لیتا ہے تو واقعی اُس کے چھپانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُس چھپنے اور سامنے آنے کے بیچ میں سے وہ اپنا آپ ہم پر ظاہر کر جاتا ہے۔ بعض اوقات تو ہماری انگلیوں کی پوریں تک شل ہونے لگتی ہیں۔ اپنی لکھتوں کا ایک انتخاب جو اس نے خود کیا اور اس کا نام ہی اُس نے ''ذاتی انتخاب'' رکھا ہے کے مطابق اسے اپنی کہانیاں "The Golem" "The Circular Ruins"، یا "Chess" پسند ہیں اور ساتھ ہی وہ حوالہ دیتا ہے۔

"Cove hold that art is expression; to this exigency, or to a deformation of this exigency, we owe the worst literature of our time".

اور اُس کے اپنے الفاظ ہیں:

"I know that my gods grant me no move than allusion or mention". August 16, 1961 (J.L.B)

تو جناب یہ ہے ہمارا بورخیس۔ یہاں اُس سے متعلق صرف چند ایک پہلو ہی سامنے آئے ہیں اور یہاں ضرورت بھی شاید اتنی ہی تھی کہ مکمل بورخیس کے لیے تو یقیناً ایک علاحدہ سے کتاب مرتب کرنی پڑے گی۔ اس نابغہ، اس یگانہ شرفیت کے اتنے رنگ ہیں، اتنے پہلو ہیں کہ ہم اُس کی اپنی تخلیق کردہ دنیا کی ''بھول بھلیوں'' میں گم ہوتے نظر آتے ہیں۔ تاریخ ہر آدمی، زمین اور موت کے ساتھ ''بھول بھلیاں'' بھی اُس کا ایک پیٹرن ہے۔ وہ تاریخ میں رہتے ہوئے ماورائے تاریخ بھی تو ہے۔

سہ چشمی کہانیاں

تخلیق: بورخیس
ترجمہ: محمود احمد قاضی

ہر کوئی مگر کوئی نہیں

اُس کے بغیر میں کوئی نہیں تھا (حتیٰ کہ اس عہد کی تصاویر بھی اسے کسی دوسرے سے مختلف پیش کرتی تھیں) اور اُس کے الفاظ کے پیچھے (جو کہ نمائشی، اشتعال دلانے والے اور مبالغہ آمیز تھے) کچھ نہیں تھا سوائے ایک جزوی طور پر ٹھنڈے خواب کے، جس کو کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ پہلے پہل اُس نے سوچا کہ ہر کوئی اُس جیسا ہی تھا۔ لیکن ایک کامریڈ نے جسے اُس نے اپنے خالی پن کا حوالہ دیا تھا اُس سے مایوس ہوتے ہوئے اُس پر اُس کی غلطی ظاہر کی تھی اور اُسے احساس دلایا تھا کہ کسی بھی فرد کو اپنی نوع سے مختلف نہیں ہونا چاہیے۔ ایک موقعے پر اُس پر کھلا کہ اُسے اپنی مشکل کا حل کتابوں میں ڈھونڈنا چاہیے اور اس طرح اُس نے تھوڑی سی لاطینی سیکھی اور یونانی میں بھی کچھ سدھ بدھ حاصل کی جس کا مشورہ اُسے ایک ہم عصر نے دیا تھا۔ بعد میں اُس نے سوچا کہ اسے وہ کچھ ڈھونڈنا چاہیے جو اُس نے انسانیت کے اساسی رسم و رواج کی تکمیل میں پایا تھا۔ اس طرح اس نے جون کے ایک لمبی سہ پہر میں قیلولے کے اوقات میں Anne Hathaway سے آغاز کیا۔ وہ اپنی عمر کے بیسویں سال کے آس پاس لندن آ گیا۔ جبلی طور پر، اُس نے پہلے ہی اپنے آپ کو 'کوئی' سمجھنے کی عادت کی تربیت دے ڈالی تھی۔ اس لیے یہ دریافت نہیں کرنا چاہیے کہ وہ "کوئی" نہیں تھا۔ لندن میں اُس نے پہلے سے تعین شدہ پیشے کو چنا یعنی ایک ایکٹر کا پیشہ جو کہ سٹیج پر لوگوں کے ہجوم کے سامنے 'کسی اور' کے ہونے کا رول ادا کرتا ہے اور لوگ بھی اُسے 'کوئی اور' ہی سمجھنے لگتے ہیں۔ اُس کے فن اداکاری نے اُسے ایک اطمینان بخشا تھا اور یہ اب تک پہلا اطمینان تھا جو اُسے حاصل ہوا تھا۔ اور پھر ایک بار جب نظم کی آخری لائن کو بہت سراہا گیا اور آخری مردہ شخص کو بھی سٹیج سے ہٹا لیا گیا تو اس نے مصنوعی پن کے نفرت انگیز ذائقے کو بھی چکھ لیا۔ وہ فیریکس یا ٹیمرلین کی صورت میں سٹیج چھوڑتا اور دوبارہ 'کوئی نہیں' بن جاتا۔ پس اُس نے مغلوب ہوتے ہوئے دوسری المیہ کہانیوں اور دوسرے سورماؤں کو تصور میں لانا شروع کر دیا۔ اور اس طرح جب کہ اس کا جسم لندن کے مے کدوں اور قحبہ خانوں میں اپنے

جسمانی مقدر کے تابع تھا وہ روحانی سطح پر کاہن کی پیشن گوئی کو خاطر میں نہ لانے والا سیزر تھا۔ دل لگی کے کھیل سے شدید نفرت کرنے والی جولیٹ اور جادوگرنیوں سے جو تباہی و بربادی (Fates) بھی تھیں خلنج زار پر اُن سے گفت گو کرنے والا میک بتھ بھی تھا۔ کوئی اور شخص اس کی طرح کبھی اتنے زیادہ آدمیوں جیسا نہیں ہوا تھا۔ مصری دیوتا (Proteus) پروٹیئس کی طرح جو ہر کسی کے روپ میں اپنے آپ کو ظاہر کرسکتا تھا۔ وقتاً فوقتاً وہ اپنی اداکاری کے کسی مبہم سرے پر ایک اعتراف کرتا جس کے متعلق اسے یقین تھا کہ اس کی کبھی رمز کشائی نہیں ہوسکتی تھی۔ رچرڈ کہتا ہے کہ وہ اپنی ذات میں بہت سے کردار ادا کرتا ہے اور آئی آ گو "I ago" متجسس انداز میں کہتا ہے ''میں جو ہوں وہ نہیں ہوں''۔ ہونے کے بنیادی واحد پن، خواب دیکھنے کے عمل اور اداکاری نے اس کی ذات کو کئی مشہور جملوں کے حوالے سے متحرک کیا۔

وہ بیس سال تک اس طے شدہ فریب نظر پر عمل پیرا رہا۔ لیکن ایک صبح وہ معدے کی گرانی، اور اُن بادشاہوں کی طرح جو بالآخر تلوار سے مر جاتے ہیں اور اُن بدقسمت عاشقوں کی طرح جو مائل اور منحرف ہوتے ہوئے ترنم ریز ہو کر مر جاتے ہیں، کے خوف میں مبتلا ہوا۔ عین اُسی دن اُس نے اپنا تھیٹر بیچ دیا۔ ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ اپنے آبائی گاؤں میں واپس چلا آیا جہاں اُس نے اپنے لڑکپن کے درختوں اور دریاؤں کو بازیاب کیا۔ اُس نے ان درختوں اور دریاؤں کا تعلق اُس بلند مرتبہ اساطیری سراب اور لاطینی کہاوت سے نہ جوڑا جسے فن کی دیوی Muse نے جشن کے طور پر منایا تھا۔ اسے 'کوئی' تو ہونا تھا پس وہ ایک ریٹائرڈ ناظم تفریحات بن گیا جس نے اپنی قسمت آزمائی: اور جسے قرض دینے، قانونی مقدمات دائر کرنے اور معمولی سود خوری میں دل چسپی تھی۔ یہ کردار میں ہی تھا یعنی اس کردار میں کہ اُس نے آخری بے روح وصیت لکھوائی اور وصیت نامہ جیسے کہ ہم جانتے ہیں اُس نے جان بوجھ کر اس میں سے رقت انگیز یادداشت اور ادبی تاثر کو شامل نہیں کیا تھا۔ اس کی پس پائی کے بعد لندن کے دوست اُس سے ملنے آیا کرتے تھے اور وہ ان کے لیے ایک بار پھر شاعر کا کردار ادا کیا کرتا تھا۔

تاریخی طور پر ہمیں مزید پتا چلتا ہے کہ اُس نے اپنی موت سے پہلے یا بعد میں اپنے آپ کو خدا کے حضور میں پایا اور کہا: ''میں، جو کہ بہت سارے آدمیوں کی صورت میں رہنے میں ناکام رہا ہوں، صرف ایک آدمی بن کر رہنا چاہتا ہوں یعنی صرف خود۔'' ایک بگولے میں سے خدا کی آواز گونجی: ''میں 'کوئی اور' نہیں ہوں۔ میں نے اسی طرح دنیا کا خواب دیکھا تھا جیسے کہ اے میرے شیکسپیئر! تم نے، اپنی اداکاری کا خواب دیکھا تھا۔ میرے خواب کی ہیئتوں میں سے ایک تمھاری تھی جو میری طرح بہت سی ہیں اور ''کوئی'' بھی نہیں۔

خاتمہ

نیچے کی طرف ڈھلواں لیٹے ہوئے ریکابیرن نے ادھ کھلی آنکھوں سے رتن کھجور بیل سے بنی ترچھی چھت کو دیکھا۔ دوسرے کمرے سے، بڑے بے ڈھنگے انداز میں، گٹار بجانے کی آواز آ رہی تھی۔ نظر نہ آنے والا یہ آلۂ موسیقی، ختم ہوتے لیکن پھر سے بجتے، لامحدود پیچ وخم پر مبنی چھوٹی سی بھول بھلیاں جیسا تھا۔

بہ تدریج وہ حقیقت کی جانب پلٹا۔ روزمرہ کی ان تفصیلات کی طرف، جو اَب تبدیل نہیں ہو سکیں گی۔ اُس نے ٹانگوں کو ڈھانپتے ہوئے کھردرے اُون سے بنے پانچو Poncho (ایک اصلاً جنوبی امریکی لباس) میں لپٹے اپنے خاصے بڑے بے کار وجود کی طرف غم گیں ہوئے بغیر دیکھا۔ باہر کھلی ہوئی کھڑکیوں کے پار میدان تھا اور سہ پہر پھیلی ہوئی تھی۔ وہ سویا رہا تھا لیکن آسمان ابھی تک روشنی سے بھرا ہوا تھا۔ بائیں ہاتھ سے ٹٹولتے ہوئے آخر کار اُس نے چارپائی سے لٹکتی ہوئی ''تانبے کی گھنٹی کو چھو لیا۔ اُس نے گھنٹی کو دو تین بار بجایا۔ دروازے کی دوسری طرف سے تاروں کے آپس میں ٹکرانے کی مدھم آواز اس تک مسلسل پہنچتی رہی۔ گٹار بجانے والا ایک نیگرو تھا جس نے ایک رات اپنی گائیکی کے فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ اُس نے کچھ اور گٹار بجانے والوں کی سنگت میں ایک اجنبی کو گائیکی کے مقابلے کی دعوت دی تھی۔ اپنی بہترین صلاحیتوں کو بہ رُوئے کار لانے کے باوجود وہ جنرل سٹور میں منڈلاتا رہا جیسے وہ کسی کا منتظر ہو۔ اُس نے بہت سا وقت گٹار بجاتے ہوئے صرف کیا لیکن دوبارہ اُس نے گانے کی ہمت نہیں کی۔ شاید اس کی شکست نے اُسے تلخ بنا دیا تھا۔ دوسرے گاہک اُس کے اس بے ضرر ساز کے عادی ہو گئے تھے۔ ریکابیرن یعنی دکان کا مالک گٹار مقابلے کی اس گائیکی کو کبھی بھلا نہیں پائے گا کیوں کہ اس سے اگلے دن ہی جب وہ خچر کی کمر پر لدے بوجھ کو درست کر رہا تھا تو اس کے جسم کا دایاں حصہ اچانک مردہ ہو گیا اور اُس کی زبان بند ہو گئی۔ ناولوں کے ہیروؤں کی بدنصیبی پر تھوڑا سا ترس کھاتے ہوئے ہم اپنی بدنصیبیوں پر بہت زیادہ ترس کھانے لگتے ہیں۔ ریکابیرن بھی ایسی استقامت کا حامل نہیں تھا جس نے اپنے فالج کو اس طرح قبول کر لیا تھا جس طرح اس سے پہلے اُس نے امریکا کی غیر مہذب تنہائی کو کیا تھا۔ جانوروں کی طرح اپنے حالات کا عادی ہوتے ہوئے اس نے اس وقت آسمان کی طرف دیکھا اور چاند کے گرد موجود ارغوانی ہالے کو بارش کی پیشین گوئی سمجھا۔

ہندوستانی خدوخال والے ایک لڑکے (غالباً اس کے بیٹوں میں سے ایک تھا) نے دروازے کو

آدھا کھولا۔ ریکا بیرن نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے پوچھا کہ کیا دکان میں کوئی شخص موجود تھا۔ خاموش طبع لڑکے نے نپے تلے اشاروں میں بتایا کہ وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ (نگرو بہ ہر حال اس شمار میں نہیں آتا تھا) لاچار آدمی اکیلا رہ گیا۔ اُس نے ایک ہاتھ سے مختصر دورانیے کے لیے گھنٹی بجائی جیسے اُس کے پاس حکم چلانے کی کوئی طاقت ہو۔

اس دن کے ڈوبتے سورج کے نیچے میدان تقریباً ایک خیالی چیز لگ رہا تھا جیسے کہ خواب میں دکھائی دیتا ہے۔ افق پر نقطے کی طرح کچھ جھلملانے لگا پھر یہ اتنا بڑا ہو گیا کہ وہ ایک گھڑ سوار میں تبدیل ہو گیا۔ وہ آیا اور پھر بلڈنگ کی طرف آتا ہوا محسوس ہوا۔ ریکا بیرن نے چوڑے کنارے والا ہیٹ، لمبا سیاہ پانچو اور چتکبرا گھوڑا دیکھا لیکن اُسے اُس آدمی کا چہرہ نظر نہیں آیا۔ آخرکار گھڑ سوار نے سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے کی باگیں کھینچیں اور وہ دلکی چال چلنے لگا۔ کوئی دو سو گز دوری پر وہ تیزی سے مڑ گیا۔ ریکا بیرن اب اسے دیکھ تو نہیں سکتا تھا لیکن اُس نے اُسے بولتے ہوئے سُنا۔ اُس نے اُسے نیچے اترتے ہوئے گھوڑے کو جنگلے کے ساتھ باندھتے اور مضبوط قدموں کے ساتھ دکان میں داخل ہوتے ہوئے محسوس کیا۔

نگرو نے اپنی آنکھیں گٹار پر سے نہ ہٹاتے ہوئے جیسے کہ وہ وہاں کچھ تلاش کر رہا ہو ملائمت سے کہا۔

''مجھے یقین تھا سینیور۔ میں آپ پر بھروسا کر سکتا تھا''

دوسرے آدمی نے کھردری آواز میں جواب دیا۔

''اور میں تم پر کر سکتا ہوں۔ کالے آدمی''۔ میں نے تمھیں بہت دنوں تک انتظار میں رکھا لیکن اب میں یہاں موجود ہوں۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی پھر نگرو نے جواب دیا۔

''مجھے انتظار کرنے کی عادت ہو گئی ہے۔ میں نے سات سال تک انتظار کیا ہے''

کسی جلدی کے بغیر دوسرے نے وضاحت کی۔

میں سات سال سے زیادہ عرصے تک اپنے بچوں سے ملے بغیر رہا۔ میں نے اُس دن ہی انھیں دیکھا تھا لیکن میں ہر وقت لڑنے والا شخص نظر نہیں آنا چاہتا۔

''میں محسوس کر سکتا ہوں، میں سمجھتا ہوں جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں''۔ نگرو نے کہا ''مجھے آپ پر یقین ہے کہ آپ نے انھیں اچھی حالت میں چھوڑا تھا''۔

اجنبی جس نے بار میں ایک نشست سنبھال لی تھی ایک گہری ہنسی ہنسا۔ اُس نے رم کا آرڈر دیا۔ اُس نے گہری رغبت سے اسے نوش کیا لیکن اسے بالکل ختم نہ کیا۔

''میں نے انھیں کچھ ایسا مشورہ دیا ہے'' اُس نے برملا کہا۔''یہ بے موقع ہرگز نہیں اور پھر اس پر کچھ خرچ بھی نہیں ہوتا۔ میں نے اور چیزوں کے ساتھ انھیں یہ بھی بتا دیا ہے کہ ایک شخص کو دوسرے کا خون نہیں بہانا چاہیے''۔

ایک سُست سُر نیگرو کے جواب سے سبقت لے گیا۔

''آپ نے بہت اچھا کیا۔ اس طرح وہ ہم جیسے نہیں ہوں گے''

''کم از کم وہ میری طرح تو نہیں ہوں گے'' اجنبی نے کہا اور پھر اُس نے مزید اضافہ کیا جیسے وہ اونچی آواز کے ساتھ کچھ چبا رہا ہو۔

''تقدیر نے مجھے مارنے پر مجبور کر دیا اور اب ایک بار پھر اس نے میرے ہاتھ میں چاقو دے دیا ہے''۔

نیگرو نے، جیسے کہ اُس نے کچھ سنا ہی نہ ہو، ایک صاحبِ نظر کی طرح کہا۔

''خزاں دنوں کی بڑھوتری کو مختصر کر دیتی ہے''

''جتنی روشنی رہ گئی ہے وہ میرے لیے کافی ہے'' اجنبی نے اپنے پاؤں پر کھڑے ہوتے ہوئے جواب دیا۔

اس نے نیگرو کے بالمقابل کھڑے ہوتے ہوئے اکتاہٹ کے ساتھ کہا۔

''اس گٹار کو چھوڑو۔ آج ایک اور طرح کا راگ تمھارا منتظر ہے''۔

دونوں آدمی دروازے کی طرف بڑھے۔ باہر نکلتے ہوئے نیگرو منمنایا۔

''شاید آج یہ سب کچھ مجھ پر اتنا ہی بھاری ہوگا جیسا کہ یہ پہلی بار ہوا تھا''

دوسرے نے سنجیدگی سے جواب دیا

''پہلی بار اس کا تم پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ تم دوسری بار کے لیے منتظر تھے''

وہ اکٹھے چلتے ہوئے مکانوں سے کچھ دور چلے گئے۔ میدان میں ایک مقام اتنا ہی اچھا تھا جتنا کہ کوئی دوسرا اور چاند چمک رہا تھا۔ اچانک انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ رک گئے اور اجنبی نے مہمیز کو علاحدہ کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے پہلے ہی اپنے پانچوؤں کو اپنی کلائیوں کے گرد باندھنا شروع کر دیا تھا۔ تب ہی نیگرو نے کہا۔

''اس سے پہلے کہ ہم الجھ جائیں میں آپ سے ایک عنایت کا خواست گوار ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مڈبھیڑ میں آپ اپنی بھرپور صلاحیتوں کا اظہار کریں جیسے کہ آج سے سات سال پہلے آپ نے میرے بھائی کو مارتے وقت کیا تھا''

مارٹن فیرو نے شاید پہلی بار اس گفت گو کے دوران نفرت کی آمیزش کو محسوس کیا تھا۔ اُس نے اپنے لہو میں ایک مہمیز سی محسوس کی۔ وہ بھڑ گئے اور تیز دھار لوہے نے نیگرو کے چہرے کو نشانہ بنایا۔

سہ پہر کا ابھی ایک گھنٹا ہی گزرا تھا کہ لگا میدان کچھ کہنے کو تھا۔ یہ کبھی کچھ نہیں کہتا یا شاید یہ بے حد و حساب کہتا ہے یا شاید ہم ہی سمجھ نہیں پاتے یا ہم سمجھ تو لیتے ہیں لیکن یہ موسیقی کی طرح قابلِ تشریح نہیں ہوتا۔

اپنی کھاٹ پر بیٹھے ہوئے ریکابیرن نے اس خاتمے کو دیکھا۔ ایک حملہ ہوا اور نیگرو پیچھے کی طرف گرا اُس کے پاؤں لڑکھڑا گئے۔ دھوکا دینے کے انداز میں وہ اپنے مخالف کے چہرے پر حملہ آور ہوا اور ایک بڑا وار کرتے ہوئے اُس نے اجنبی کی چھاتی کو چیر دیا۔ پھر ایک اور زخم لگا یا جو کہ دکان کا مالک واضح طور پر نہ دیکھ سکا اور فیرو اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکا۔ نیگرو ساکت کھڑا اپنے دشمن کو موت کی تکلیف کو سہتے ہوئے دیکھنے لگا۔ اُس نے اپنے خون آلود چاقو کو گھاس پر صاف کیا اور پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر وہ مکانوں کے ابھار کی طرف آہستہ سے چل دیا۔ اُس نے اپنا جائز مشن مکمل کر لیا تھا وہ کوئی نہیں تھا۔ زیادہ مناسب انداز میں کہا جائے تو یہ کہ وہ ایک اجنبی بن گیا تھا۔ اس زمین پر اس کا کوئی اور مشن نہیں تھا مگر اس نے ایک شخص کو مار دیا تھا۔

محل کی حکایت

اُس دن پہلے شہنشاہ نے اپنے محل میں سے شاعر کی نمائش کا اہتمام کیا۔ جب وہ باغ کی ڈھلان سے چمک دار آئینوں اور گنجلک جونیپر[1] کی باڑ جس کی مشابہت بھول بھلیوں جیسی تھی کی طرف چل رہے تھے۔ وہ اپنے پیچھے ایک ایک کر کے مغربی طرز کی ایسی مہتابیاں[2] چھوڑے جا رہے تھے جو تقریباً لامتناہی ایمفی تھیٹرز کی گریڈائن[3] کی طرح تھیں۔ پہلے تو ایسے لگا جیسے وہ باہمی رضامندی سے کوئی کھیل کھیل رہے ہوں۔ لیکن بعد میں وہ کسی بدگمانی یا اندیشے کے بغیر نیچے کی طرف جانے والے اُن سیدھے راستوں کے مسلسل نازک موڑوں اور چھپی ہوئی گولائیوں میں گم ہو گئے۔ آدھی رات کو سیاروں کے مشاہدے اور ایک بروقت اور موزوں کچھوے کی قربانی دینے کی وجہ سے ان کی اس بہ ظاہر طلسمی اقلیم سے گلوخلاصی ہوئی لیکن وہ آخر تک اپنے آپ کو گم ہو جانے کے احساس سے نہ چھڑا سکے۔ بعد میں وہ خواب گاہوں، انگنائیوں، لائبریریوں اور آبی گھڑی سے مزین ڈرائنگ روموں میں سے گزرے اور ایک صبح انھوں نے ایک بُرج سے ایک پتھر کا آدمی تخلیق کیا جو اُن سے ہمیشہ کے لیے کھو گیا۔ چندن کی لکڑی سے بنے ڈونگے

میں انھوں نے سب سے درخشاں دریاؤں کو یا صرف ایک ہی دریا کو کئی بار پار کیا۔ شاہی جلوس گزرتا تو لوگ زمین بوسی کرتے لیکن ایک دن وہ ایک ایسے جزیرے پر پہنچے جہاں ایک شخص نے ایسا نہ کیا کیوں کہ اُس نے کبھی "آسمانی بیٹے" کو نہیں دیکھا تھا اور جلاد کو اس کا سر قلم کرنا پڑا۔ ان کی آنکھوں نے کالے بالوں والے سروں، کالے رقصوں اور سونے کے پیچیدہ نقابوں کو لاتعلقی سے دیکھا جو حقیقی تھا، خود کو اُس سے جو خواب میں دیکھا گیا تھا، گڈمڈ کرتا تھا بل کہ اس سے بھی زیادہ جو خواب کی ہیئتوں میں سے ایک تھا وہی حقیقی تھا۔ یہ ناممکن معلوم ہوتا تھا کہ زمین باغوں، آبی گزرگاہوں، فنِ عمارت گری اور شان و شوکت کی دوسری ہیئتوں کے علاوہ کوئی چیز ہو۔ ہر سو قدم پر ایک بُرج ہوا کو کاٹتا تھا۔ آنکھوں کو اُن کا رنگ ایک جیسا لگتا تھا حالاں کہ پہلا پیلا اور آخری قرمزی تھا۔ اُن کی درجہ بندی بہت نازک اور سیریز بہت لمبی تھی۔

آخری برج کی بنیاد کے قریب اُس شاعر نے (جو اُن تمام عجائبات سے جو سب کے لیے ایک عجوبہ تھے بے تعلق سا لگتا تھا) ایک مختصر نظم پڑھی جسے آج ہم ایک زندہ رہنے والی نظم کے طور پر یاد کرتے ہیں اور جیسا کہ خوش اسلوب مورخین اکثر کہتے ہیں کہ شاعر نے اس نظم کو موت اور ابدیت کے طور پر پیش کیا ہے۔ اس کا متن گم ہو چکا ہے۔ کچھ کے نزدیک یہ نظم صرف ایک سطر پر مشتمل تھی جب کہ دوسرے کہتے ہیں کہ یہ صرف ایک لفظ پر مبنی تھی۔ حتمی اور ناقابلِ یقین بات یہ ہے کہ یہ بے حد وسیع محل اس نظم میں اپنی باریک ترین جزئیات کے ساتھ موجود تھا۔ شان دار ظروف چینی اور اُن کے ڈیزائن۔ صبحِ صادق کی روشنی اور شام کے دھندلکے، اژدہوں، دیوتاؤں اور فانیوں کے اس شان دار سلسلۂ شاہی کا یہ خوش باش یا بدقسمت باشندہ جو کہ اس کے ناقابلِ پیائش ماضی میں آباد رہا تھا... ہر کوئی خاموش تھا لیکن شہنشاہ بے ساختہ بول اٹھا "تم نے مجھے میرے محل سے محروم کر دیا ہے" اور جلاد کی تلوار نے شاعر کی گردن اڑا دی۔

کچھ لوگ اس کہانی کو مختلف انداز سے بیان کرتے ہیں۔ دنیا میں کوئی بھی دو چیزیں ایک جیسی نہیں ہو سکتیں۔ ان کا کہنا ہے کہ شاعر کو تو محض ایک نظم پڑھنا تھی جب کہ محل اس کے آخری الفاظ کی ادائی کے ساتھ ہی منظر سے مٹ گیا، غائب ہو گیا اور ختم ہو گیا۔ یقین مانیے ایسے اسطورہ ادبی تخیلات سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔

شاعر شہنشاہ کا غلام تھا اور وہ اسی غلامی میں مر گیا۔ اُس کی نظم اس لیے بھلا دی گئی کیوں کہ وہ فراموش کر دیے جانے کے ہی قابل تھی۔

اس کی نسل کے لوگ ابھی تک متلاشی ہیں لیکن وہ اس کائنات سے متعلق لفظ ڈھونڈ نہیں پائیں گے۔

(۱) ایک قسم کی صنوبری، سدابہار جھاڑی
(۲) بالکنیاں
(۳) سیڑھیوں یا نشستوں کی قطار در قطار کا ایک سلسلہ

گیارہ بھول بھلیاں

تخلیق: بورخیس　　　ترجمہ: محمد عاصم بٹ

آئینہ اور نقاب

کلانٹرف کی جنگ تمام ہوئی اور ناروے کی فوجوں کو شکست فاش ہوئی تو آئرلینڈ کے بادشاہ نے اپنے درباری شاعر سے کہا، ''عظیم کارہائے نمایاں کو اگر لفظوں کے سکوں میں نہ ڈھالا جائے تو وہ اپنی تابانی کھو دیتے ہیں۔'' کچھ توقف کے بعد وہ پھر سے گویا ہوا، ''میں چاہتا ہوں تم میری فتح اور عظمت کے گیت گاؤ۔ میں اینیس ہو جاؤں اور تم میرے ورجل بنو۔ کیا تم خود کو اس منصب کے اہل سمجھتے ہو۔ جو ہم دونوں کو جاوداں بنا دے گا۔''

''ہاں میرے آقا'' شاعر نے کہا، ''میں اولان ہوں۔ میں نے بارہ موسم سرما عروض کا علم سیکھنے میں صرف کیے۔ مجھے تین سو ساٹھ دیو مالائی قصے زبانی یاد ہیں جو سچی شاعری کی بنیاد ہیں۔ السٹر اور منسٹر کی داستانیں میرے بربط کی تاروں میں قید ہیں۔ قواعد نے مجھے استناد بخشا ہے۔ میں اپنی زبان کے قدیم ترین الفاظ اور انتہائی پیچیدہ استعارے بے تکلف استعمال کرنے پر قادر ہوں۔ میں نے لکھنے کے راز کو پایا ہے جو ہمارے فن کو عوام الناس کی ناقدر شناس نظروں سے محفوظ رکھتا ہے۔

میں محبتوں، مویشی چوری کرنے والوں کی کارستانیوں، سیاحتوں اور جنگوں کو نظم کر سکتا ہوں۔ میں آئرلینڈ کے تمام شاہی گھرانوں کے مابعد الطبیعیاتی حسب نسب سے بھی آگاہ ہوں۔ مجھے شاہی جوتش، ریاضیات، مذہب اور نباتات کا علم حاصل ہے۔ میں نے عوامی مقابلوں میں اپنے حریفوں کو مات دی

ہے۔ میں نے ہجو پر عبور حاصل کیا جو جلدی امراض کا باعث بنتا ہے اور ان امراض میں جذام بھی شامل ہے۔ مجھے تلوار پر گرفت رکھنا آتا ہے جیسا میں نے آپ کی جنگ میں ثابت کیا ہے۔ بس ایک ہی بات ایسی ہے جو مجھ سے نہیں ہو سکتی کہ آپ کی عنایات کا شکریہ کیسے ادا کروں۔"

بادشاہ نے' جو طویل خطبات' اور خاص طور پر دوسروں کے خطبات سے جلد بے زار ہو جاتا تھا' بڑے سکون سے کہا "مجھے ان سب باتوں کا اچھی طرح علم ہے۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ کچھ ہی روز پہلے انگلستان میں بلبل اپنی جنوبی سرزمینوں سے لوٹ آئے ہیں۔ تم اپنا قصیدہ دربار اور شعرا کی مجلس میں پڑھنا۔ میں تمھیں ایک سال کی مہلت دیتا ہوں۔ تم ہر حرف اور ہر لفظ کو سنوارنا۔ جیسا کہ تم جانتے ہو اس کا انعام میرے شاہی دستور کے مطابق تمھاری تفکر سے بھری بے نیند راتوں سے کم نہیں ہوگا۔"

"بادشاہ سلامت آپ کے چہرۂ پرنور کے دیدار سے بڑھ کر بھلا کیا اجر ہو سکتا ہے۔" شاعر نے کہا جو ایک درباری بھی تھا۔ پھر جھک کر کورنش بجالایا اور رخصت ہوا۔ چند ایک اشعار اس کے ذہن میں ابھی سے گردش کرنے لگے تھے۔

سال گزر گیا۔ یہ وباؤں اور بغاوتوں کا دور تھا۔ شاعر نے قصیدہ پیش کیا۔ اس نے اسے آہستہ روی اور اعتماد کے ساتھ مسودے پر نگاہ ڈالے بغیر پڑھا۔ سر کے اشارے سے بادشاہ نے اپنی خوش نودی کا اظہار کیا۔ ہر کسی نے اس اشارے کی پیروی کی۔ حتیٰ کہ ان لوگوں نے بھی جو باہر دروازوں میں ہجوم کیے کھڑے تھے اور کوئی ایک لفظ بھی ادا کرنے سے قاصر تھے۔ آخر میں بادشاہ نے خطاب کیا۔

"مجھے تمھاری محنتوں کا اعتراف ہے۔ یہ دوسری فتح ہے۔ تم نے ہر لفظ کو اس کے حقیقی معنی اور ہر اسم ذات کو وہی وصف دیا ہے جو قدیم زمانوں کے شعرا نے اس سے منسوب کیا۔ تمھارے قصیدے میں ایک خیال بھی ایسا نہیں جو ادبیات عالیہ کے لیے ناشناسا ہو۔ جنگ مردوں کا خوب صورت پارچہ ہے اور خون تلوار کا گھونٹ ہے۔ تم نے بڑی فن کاری کے ساتھ قافیہ، تجنیس لفظی، ردیف، اوزان صوتی اور فاضلانہ فن خطابت کی تراکیب کو نبھایا ہے۔ اگر آئرلینڈ کا تمام ادب فنا ہو جائے جو ایک بدشگون امر ہوگا تو اسے بغیر کسی نقصان کے محض تمھاری اس عظیم نظم کی بنا پر از سرِ نو تخلیق کیا جا سکتا ہے۔ تیس کاتب اسے بارہ بارہ مرتبہ لکھیں گے۔"

ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ بادشاہ پھر سے گویا ہوا "ہر چیز ٹھیک ہے لیکن اس کے باوجود کہیں کچھ نہ ہوا۔ ہماری شریانوں میں خون کی گردش تیز نہیں ہوئی۔ ہمارے ہاتھ تعظیم کے ساتھ جھکے نہیں۔ کسی کا رنگ زرد نہیں ہوا۔ کسی نے کوئی رزمیہ چیخ نہیں ماری یا کسی نے بحر شمالی کے ڈاکوؤں کے خلاف نفرت کا اظہار نہیں

کیا۔ اگلا سال ختم ہونے سے پہلے اے شاعر ہم تمھاری ایک مزید نظم کی داد دینا چاہیں گے۔ ہماری خوش نودی کی نشانی کے طور پر تم یہ آئینہ رکھو جو چاندی کا بنا ہوا ہے۔''

''میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور ساری بات سمجھ گیا ہوں۔'' شاعر نے جھک کر کہا۔

آسمان پر ستارے اپنے روشن راستوں پر محوِ گردش رہے۔ ایک بار پھر بلبلوں نے سیکسن کے جنگلوں میں اپنے سُر بکھیرے۔ شاعر اپنے مسودے کے ساتھ لوٹا جو پہلے سے مختصر تھا۔ اس نے اسے یادداشت کے بل پر نہیں گایا بل کہ اسے پڑھا۔ واضح طور پر ہچکچاتے ہوئے، خاص خاص قطعات عمداً حذف کرتے ہوئے جیسے وہ خود انھیں کلی طور پر سمجھ نہیں پایا تھا یا انھیں پڑھ کر اس کی بے حرمتی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ نظم خاصی عجیب تھی۔ یہ جنگ کی روداد نہیں تھی بل کہ خود ایک جنگ تھی۔ اس کے جنگجویانہ انتشار میں ایک کشمکش تھی۔ خدا (جو بہ یک وقت تین اور ایک ہے)، آئرلینڈ کے دیوی دیوتاؤں اور ان لوگوں کے بیچ جاری ایک کشمکش جو برسوں بعد 'Elder Edda' کے آغاز پر جنگ شروع کریں گے۔ نظم کی ہیئت بھی کچھ کم عجیب نہیں تھی۔ ایک انوکھا اسم ایک فعل جمع پر غالب۔ حرف جار ایسے جو عام طور پر مستعمل نہیں تھے۔ درشتی ملائمت سے بدل جاتی تھی۔ استعارے بے قاعدہ تھے یا پھر ایسے معلوم ہوتے۔

بادشاہ نے اپنے گرد کھڑے صاحب بصیرت افراد سے کچھ گفت گو کی اور پھر شاعر سے مخاطب ہوا۔

''تمھاری پہلی نظم کے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ آئرلینڈ میں گائی گئی تمام نظموں کا موزوں خلاصہ تھی۔ لیکن یہ اس پر سبقت لے گئی ہے بل کہ یہ ہر اس شاہ کار کو فنا کر دینے کے لیے کافی ہے جس سے اس کا موازنہ کیا جائے۔ یہ انسان کو ششدر اور اس کی آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے۔ کم علم لوگ ہی اس کی وقعت سے لاعلم رہیں گے۔ جب کہ فضلا جو تعداد میں مختصر ہیں اس کے محاسن سے کما حقہٗ آگاہ ہیں۔ اس کی واحد جلد کے لیے بہترین جگہ ہاتھی دانت کا صندوقچہ ہوگی۔ لیکن اس قلم سے جس سے ایسا ممتاز کارنامہ انجام پذیر ہوا، ہم ایک مزید عالی مرتبہ نظم کی توقع کرتے ہیں۔'' بادشاہ مسکرایا اور گویا ہوا ''ہم ایک حکایت کے کردار ہیں۔ اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ حکایات میں تین کا عدد غالب اور خاص اہمیت کا حامل ہے۔''

بادشاہ نے بیان جاری رکھا ''ہماری خوش نودی کی نشانی کے طور پر یہ طلائی نقاب لو۔''

''میں آپ کا شکر گزار ہوں اور ساری بات سمجھ گیا ہوں''۔ شاعر نے جھک کر کہا۔

سال بعد پھر سے یہ موقع آیا۔ محل کے سپاہیوں نے دیکھا کہ شاعر کے ہاتھ میں کوئی مسودہ نہیں تھا۔ بادشاہ نے حیرت کے ساتھ اسے دیکھا۔ شاعر ایک مختلف آدمی دکھائی دیتا تھا۔ امتدادِ زمانہ کی بہ جائے کسی

دوسری قوت نے اس کے نقوش کو بدل دیا تھا۔ اس کی آنکھیں فاصلے پر کہیں ٹکی ہوئی یا بے نور معلوم ہوتی تھیں۔ شاعر نے التجا کی کہ وہ تخلیے میں بادشاہ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔ غلام حجرے سے چلے گئے۔

''کیا تم نے نظم نہیں لکھی۔'' بادشاہ نے پوچھا۔

''ہاں لکھی ہے۔'' شاعر نے دکھ کے ساتھ جواب دیا، ''لیکن شاید ہمارے آقا عیسیٰ مسیح مجھے اس سے منع فرمائیں گے۔''

''کیا تم اسے دہرا سکتے ہو۔''

''مجھ میں اتنی جرأت نہیں ہے۔''

''میں تمھیں یہ جرأت دوں گا جو تم میں نہیں ہے۔'' بادشاہ نے کہا۔

شاعر نے وہ نظم پڑھی۔ یہ صرف ایک مصرعے پر مشتمل تھی۔ اسے با آواز بلند دہرانے کی جسارت کیے بغیر شاعر اور بادشاہ نے اسے پڑھا جیسے یہ کوئی خفیہ عبادت یا کلمہ کفر تھا۔ شاعر ہی کے مانند بادشاہ بھی دہشت زدہ اور مغلوب ہو گیا۔ دونوں زرد چہروں کے ساتھ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

''اپنی جوانی میں'' بادشاہ نے کہا ''میں غروب آفتاب تک کشتی چلاتا رہا۔ ایک جزیرے پر میں نے چاندی کے شکاری کتے دیکھے جنھوں نے طلائی سؤروں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ ایک دوسرے جزیرے پر طلسمی سیبوں کی مہک نے مجھے مسحور کیا۔ تیسرے پر میں نے آگ کی دیواریں دیکھیں۔ تمام جزیروں سے دور ایک جزیرے پر ایک محرابی اور معلق دریا آسمان کو کاٹتا بہہ رہا تھا اور اس کے پانیوں میں مچھلیاں اور کشتیاں تیرتی تھیں۔ یہ تحیر خیز مناظر تھے، لیکن ان کی حیرت کا تمھاری نظم سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا جو ایک اعتبار سے ان تمام کا احاطہ کرتی ہے۔ کس سحر کی یہ دولت تم نے اسے پایا ہے۔''

''صبح سویرے میں یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے، جنھیں اول اول میں نہیں سمجھ سکا، بیدار ہوا،'' شاعر بولا ''یہ الفاظ ایک نظم تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے۔ ایسا گناہ جسے شاید خدائے بزرگ کبھی معاف نہیں فرمائیں گے۔''

''ایسا گناہ جس میں اب ہم دونوں ملوث ہیں'' بادشاہ نے سرگوشی میں کہا۔ ''حسن کو جان لینے کا گناہ۔ یہ تو ایسا راز ہے جسے انسان سے پردے میں رکھا گیا۔ اب ہم پر فرض ہے کہ کفارہ ادا کریں۔ میں نے تمھیں ایک آئینہ اور ایک طلائی نقاب دیا تھا۔ یہ میرا تیسرا تحفہ ہے جو آخری بھی ہوگا''۔ شاعر کے دائیں ہاتھ میں اس نے ایک خنجر دیا۔

شاعر کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ اس نے محل سے نکلتے ہی خود کو قتل کر ڈالا۔ جب کہ بادشاہ اب ایک گداگر ہے اور آئرلینڈ کے طول و عرض میں بھٹکتا پھرتا ہے جو کبھی اس کی بادشاہت تھی۔ اس کے بعد اس نے کبھی وہ نظم نہیں دہرائی۔

بابل میں قرعہ اندازی

بابل کے تمام افراد کی طرح میں بھی ایک صوبے دار رہ چکا ہوں۔ سبھی کی طرح ایک غلام بھی۔ مجھے قدرت کاملہ، رسوائی اور اسیری جیسی کیفیات کا تجربہ ہے۔ دیکھیے میرے دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت غائب ہے اور میری قبا کے چاک میں سے آپ کو میرے پیٹ پر ایک سرخ ٹیٹو گودا ہوا دکھائی دے گا۔ یہ دوسری علامت 'ب' ہے۔ یہ نشان پورے چاند کی راتوں میں مجھے 'ج' نشان والوں پر غلبہ عطا کرتا ہے لیکن 'الف' نشان والوں کے زیرِ دست بھی کرتا ہے جو بے چاند راتوں میں 'ج' نشان کے طالع ہوتے ہیں۔

علی الصبح نیم اجالے میں، میں نے ایک تہ خانے میں ایک سیاہ پتھر کے سامنے مقدس سانڈوں کی شہ رگیں کاٹ ڈالیں۔ ایک قمری سال کے دوران مجھے غیر مرئی قرار دیا گیا۔ میں چلایا مگر انھوں نے میری ایک نہ سنی۔ میں نے روٹی چرائی لیکن انھوں نے میرا سر قلم نہیں کیا۔ میں وہ کچھ جان چکا ہوں جس سے یونانی لاعلم تھے، یعنی عدم تیقن۔ ایک کانسی کے کمرے میں گلا گھونٹنے والے کے خاموش ریشمی رومال کے آگے بھی امید نے مجھ سے حق وفاداری نبھایا۔ ہرقلیتس پونٹیکس حیرت کے ساتھ بتاتا ہے کہ فیثا غورث کو یاد تھا کہ وہ پہلے فائیرس رہ چکا تھا۔ اس سے بھی پہلے یوفوربس تھا اور اس سے بھی پہلے کسی دوسری فانی جون میں۔ لیکن ایسی ہی متغیر صورتوں کو یاد کرنے کے لیے مجھے موت یا حتیٰ کہ کسی فریب سے رجوع کرنے کی حاجت نہیں ہے۔

میں ایسی وحشیانہ گونا گونی کے لیے ایک ادارے کا زیرِ بار احسان ہوں جس سے دیگر جمہوری ریاستیں بے خبر ہیں یا جو اِن میں ایک غیر پختہ اور مخفی انداز میں سرگرم ہے، یعنی قرعہ اندازی۔ میں اس کی شروعات پر بات کرنے میں وقت ضائع نہیں کروں گا۔ میں جانتا ہوں کہ اہلِ علم و دانش اس بارے میں متفق نہیں ہو سکتے۔ میں اس کے طاقت ور مقاصد سے بس اتنا ہی آگاہ ہوں، جتنا ایک شخص جسے علمِ نجوم میں مہارت نہیں ہے، چاند کے بارے میں جان سکتا ہے۔ میں ایک سرگرداں سرزمین سے آیا ہوں جہاں قرعہ اندازی حقیقت کی بنیاد سمجھی جاتی ہے۔ آج کے دن تک میں نے اس بارے میں اتنا ہی کم سوچا جتنا

میں نے لاتخیل احکام ربانی کے اطوار یا اپنے دل کے بارے میں سوچا ہوگا۔اب بابل اور اس کے محبوب ریت رواج سے بہت دور میں خاص تعجب کے ساتھ قرعہ اندازی اور ان ملحدانہ منتروں کے بارے میں سوچتا ہوں جنھیں نقاب پوش چاندنی راتوں میں بڑبڑاتے تھے۔

میرا باپ کہا کرتا تھا کہ پہلے پہل، یہ صدیوں پہلے کی بات ہے یا شاید برسوں پہلے کی، کہ بابل میں قرعہ اندازی ایک ادنیٰ عوامی قسم کا کھیل تھا۔ اسے یاد تھا (میں نہیں جانتا، اس کی یادداشت کس حد تک درست تھی) کہ حجام تانبے کے سکوں کے عوض ہڈی یا علامتوں سے مزین چرمی کاغذ کے مستطیل ٹکڑے بیچتے۔ نصف النہار کے وقت قرعہ اندازی ہوتی تھی۔ جیتنے والوں کی خوش قسمتی کو مزید کسی آزمائش میں ڈالے بغیر انھیں چاندی کے سکے دیے جاتے۔ جیسا کہ آپ محسوس کر سکتے ہیں، یہ نظام ابتدائی درجے کا تھا۔

قدرتی طور پر یہ قرعہ اندازیاں ناکام ہوئیں۔ ان کی اخلاقی وقعت صفر تھی۔ وہ انسان کی تمام اہلیتوں سے علاقہ نہیں رکھتی تھیں۔ بلکہ محض امید پر ان کا دارومدار ہوتا۔ عوام کی عدم دل چسپی کے سبب تجار کو، جنھوں نے ان زراندوز قرعہ اندازیوں کی داغ بیل ڈالی تھی، ہاتھ سے رقم کھونا پڑی۔ کسی نے اس میں اصلاح کی کوشش کی۔ یعنی موافق اعداد کی فہرست میں چند غیر موافق اعداد کا اضافہ کیا۔ اس اصلاح کے ذریعے اعداد والے مستطیل پارچوں کے خریدار دہرا جوکھم مول لیتے۔ رقم جیت جانے اور جرمانہ ادا کرنے کا۔ اس معمولی احتمال نے، کہ ہر تیس موافق اعداد میں ایک غیر موافق عدد بھی ہے، جیسا کہ بالکل فطری ہے، عوام کی دل چسپی کو بیدار کیا۔ اہل بابل نے خود کو اس کھیل میں جھونک دیا۔ جنھوں نے ان مواقع سے استفادہ نہیں کیا، انھیں کم ظرف اور بزدل سمجھا گیا۔ بعض اوقات یہ بجا طور پر تنافر دو چند ہو جاتا۔ جو یہ کھیل نہیں کھیلتے تھے، وہ لائق حقارت ٹھہرتے۔ لیکن ان کی بھی استہزا سرائی ہوتی جو ہار جاتے اور جرمانہ ادا کرتے۔ کمپنی کو (جو نام تب عام ہو گیا تھا) جیتنے والوں کے معاملات کو طے کرنا پڑتا جو اپنے انعامات کی رقم وصول کرتے تھے کیوں کہ جرمانے کی رقم اکٹھی ادا نہیں کی جاتی تھی۔

یوں ہارنے والوں کے خلاف مقدمات کا آغاز ہوا۔ جج نے انھیں سزا سنائی کہ اصل جرمانے اور دیگر اخراجات کی رقم ادا کریں، بہ صورت دیگر انھیں جیل میں چند روز گزارنے ہوں گے۔ سبھی نے کمپنی سے فریب کرنے کی نیت سے جیل جانے کو ترجیح دی۔ تاہم ابتدا میں چند لوگوں کی دکھاوے کی خودسری اور دلیری کمپنی کی موجودہ قادر مطلقی اور اس کی مابعد الطبیعی اور کلیسائی قوت کا منبع بنی۔

تھوڑے ہی عرصے بعد قرعہ اندازی کی فہرستوں میں سے جرمانوں کی رقمیں منہا کر دی گئیں اور یہ اسیری کی اس میعاد کے تعین تک محدود ہو گئیں جو ہر غیر موافق عدد کے ساتھ منتھی تھی۔ اختصار پسندی کا یہ

رجحان، جس پر تب خاص توجہ نہیں دی گئی، بعدازاں بنیادی اہمیت کا حامل قرار پایا۔ یہ قرعہ اندازی کے کھیل میں غیر مالیاتی عناصر کا اولین ظہور تھا۔ پھر عدیم المثال کامیابی کا ظہور ہوا۔ خریداروں کے اصرار پر کمپنی غیر موافق اعداد کی تعداد میں اضافے پر مجبور ہوگئی۔

سبھی جانتے ہیں کہ اہل بابل منطق اور موزونیت کے شائق ہیں۔ یہ بات غیر منطقی لگتی تھی کہ خوش بخت اعداد کو تو گول سکوں میں تولا جائے اور بد بخت اعداد کو اسیری کے دن اور راتوں میں۔ چند معلمین اخلاق نے استدلال کیا کہ ملکیت زر ہمیشہ مسرت کا باعث نہیں ہوتی۔ مسرت کی دیگر صورتیں کہیں زیادہ مؤثر ہو سکتی ہیں۔

ایک اور معاملے نے بھی غریب عوام کو بدگمان کیا۔ راہبوں کے مدرسے کے اراکین نے قرعہ اندازی کے لیے اپنی رقمیں کئی گنا بڑھا لیں اور پھر خود ہی امید اور خوف کے نشیب و فراز سے محظوظ ہونے لگے۔ غربا (قابل جواز یا ناگزیر حسد کے ساتھ) یہ سمجھ چکے تھے کہ وہ قسمت کے بدنام اور متلذذ کھیل سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ اس بہ جا مطالبے کے تحت کہ امیر غریب سبھی کو مساوی طور پر اس قرعہ اندازی میں شریک ہونا چاہیے، ایک غضب ناک احتجاج کو تحریک ہوئی جس کی یاد برسوں بعد بھی ذہن سے محو نہیں ہو سکی۔ چند کج فہم لوگوں نے یہ بات نہیں سمجھی (یا ایسا ظاہر کیا کہ وہ نہیں سمجھے) کہ یہ نئی تنظیم تاریخ کی ایک نئی اور ضروری منزل ہے۔

کسی غلام نے ایک قرمزی رنگ کا ٹکٹ چرا لیا۔ جب قرعہ اندازی میں اس کا جرمانہ اُس کی زبان جلا دینے کی صورت میں نکلا تو قانونی ضابطے میں طے کیا گیا کہ یہی سزا ان لوگوں کو بھی دی جائے جو ٹکٹ کے سرقے کے مرتکب ہوں گے۔ چند اہل بابل نے تجویز دی کہ اُسے ایک چور کی حیثیت سے آہنی سلاخوں کی سزا دی جائے۔ چند ایک نے فراخ دلانہ طور پر کہا کہ جلاد کو اختیار دیا جائے کہ وہ جو چاہے اسے سزا دے کیوں کہ تقدیر کا یہی تقاضا تھا۔ شورشوں نے سر اُٹھایا۔ خونیں افسوس ناک قرعہ اندازیاں ہوئیں لیکن اہل بابل کی اکثریت نے بالآخر اپنے ارادے کو امرا کی مخالفت کے باوجود منوا لیا۔ عوام نے اپنے فراخ دلانہ مقاصد کو مکمل طور پر حاصل کر لیا۔

اس سے کمپنی اجتماعی عوامی طاقت کو ماننے پر مجبور ہوگئی۔ نئی سرگرمیوں کی پیچیدگی اور پھیلاؤ کے پیش نظر ایسا عوامی اتحاد ناگزیر تھا۔ دوم اس طور قرعہ اندازی خفیہ، آزادانہ اور عمومی سطح پر ہونے لگی۔ ٹکٹوں کی نقد فروخت ممنوع قرار دے دی گئی۔ بعد کی اسطورہ کے تحت ہر آزاد انسان خود بہ خود ان خفیہ قرعہ اندازیوں میں شریک ہو جاتا جو ہر ساٹھویں رات کو دیوتا کی بھول بھلیوں میں رونما ہوتی اور اگلی قرعہ اندازی تک ہر

شخص کی تقدیر کا تعین کرتی۔ اس کے نتائج بعید از شمار تھے۔ ایک خوش بخت بازی کسی شخص کو ترقی دے کر دانش مندوں کی مجلس میں عہدہ دلا سکتی یا اُسے اپنے (معروف یا نجی) دشمن کو قفس میں ڈالنے کا اختیار دے سکتی تھی اور یوں بھی ہوتا کہ اُسے اپنے کمرے کی پُر سکون تاریکی میں ایک عورت ملتی جو اسے ترغیب دیتی اور جس کو وہ دوبارہ کبھی دیکھنے کی امید کھو چکا ہوتا تھا۔ جب کہ ایک سیاہ بخت بازی کسی عضو بدن کو کاٹ ڈالنے، مختلف انداز کی روسیاہی یا موت کی صورت میں منتج ہو سکتی تھی۔ بعض اوقات واحد واقعہ، کہ 'ج' کا بے ہودہ قتل یا 'ب' کا پُراسرار طور پر دیوتا کے درجے پر تقرر تمیں چالیس قرعہ اندازیوں کا خوش گوار نتیجہ ہوتا۔ قرعہ اندازیوں کو باہم ملانا مشکل تھا لیکن یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ کمپنی کے اہل کار قادر مطلق اور عیار تھے اور اب بھی ہیں۔

بہت سی صورتوں میں یہ علم ہو جاتا کہ خاص طرح کی مسرتیں محض اتفاق کے باعث پیدا ہوتی ہیں، ان کی ساکھ کو نقصان پہنچا سکتا تھا۔ اس کے سدِ باب کے لیے کمپنی کے کارندوں نے ترغیب اور جادو کی طاقت کو بہ روئے کار لانا شروع کیا۔ ان کے اقدامات، ان کی حرکات سب خفیہ تھیں۔ عوام کی اُمیدوں اور خوف سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے ان کے پاس ماہر نجوم اور جاسوس موجود تھے۔ خاص پتھر کے شیر بھی موجود تھے۔ ایک مقدس 'جائے ضرور' یہ بھی موجود تھی جس کا نام 'قفقہ' تھا۔ ایک گرد آلود پکے نالے میں درزیں موجود تھیں جو عمومی رائے کے مطابق کمپنی کی طرف جاتی تھیں۔ کینہ توز اور کریم النفس لوگ ان جگہوں پر آکر حاصل شدہ معلومات درج کرواتے۔ حروفِ تہجی کے لحاظ سے ترتیب دی گئی فائل میں ان مختلف درجہ کی معتبر معلومات کو اکٹھا کیا جاتا۔

حیرت انگیز طور پر کچھ شکایتیں بھی موصول ہوتی تھیں۔ کمپنی اپنی عمومی دور اندیشی کے تحت براہِ راست ان کا جواب نہیں دیتی تھی۔ ترجیحاً ایک نقاب بنانے والے کارخانے میں لکڑی کے بے کار ٹکڑوں پر ایک بدخط مختصر تحریر گھسیٹ دی جاتی جو اَب مقدس منقولات میں شمار ہوتی ہے۔ یہ پُراسرار بات ظاہر کرتی ہے کہ قرعہ اندازی دنیا کی تنظیم میں 'اتفاق' کے اضافے کا نام ہے اور یہ کہ اس کو تسلیم کرنا 'اتفاق' کو رد کرنا نہیں ہے بل کہ اس کی توثیق کرنا ہے۔

اس اعلان نے عوام کی بے چینی کو فرو کر دیا۔ اس سے مختلف نتائج برآمد ہوئے جو غالباً اعلان نامے کے مصنف کے گمان میں بھی نہیں تھے۔ اس سے کمپنی کے افعال اور رویے میں شدید اصلاحات رونما ہوئیں۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں بچا۔ انھوں نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ جہاز لنگر اٹھانے ہی والا ہے۔ تاہم میں اس بات کی وضاحت کی کوشش کروں گا۔

یہ بات خارج ازامکان معلوم ہوتی ہے کہ اب سے پہلے کسی نے اتفاق کا عمومی نظریہ وضع کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ اہل بابل منصوبہ ساز نہیں ہیں۔ وہ قسمت کے فیصلوں کی تعظیم کرتے ہیں۔ ان کی خاطر اپنی زندگیاں، اپنی امیدیں، اپنے خوف سب اس پر نچھاور کردیتے ہیں۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ تقدیر کے چیستانی قوانین اوران چکردار کرّوں کی تحقیق کریں جن سے یہ قوانین وارد ہوتے ہیں۔ تاہم اس غیر سرکاری اعلان سے، جس کا میں نے ابھی ذکر کیا، قانونی ریاضیاتی نوعیت کے کئی ایک مباحث کی ابتدا ہوئی۔ ان میں سے چند ایک سے درج ذیل قیاس پیدا ہوا: اگر قرعہ اندازی قسمت کی ایک سنگین صورت ہے، کائنات میں انتشار کا مسلسل نفوذ ہے، تو کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ قسمت کا دخل قرعہ اندازی کی بہ جائے ہر معاملے میں ظاہر ہو۔ کیا یہ مضحکہ خیز بات نہیں ہے کہ قسمت کسی کے نام موت کا پروانہ جاری کرے۔ لیکن اس موت کے اسباب، ان کا اخفا یا مشتہر ہونا، ان کا ایک گھنٹے یا ایک صدی کے بعد رونما ہونا، یہ سب باتیں اس کی دست رس سے باہر ہیں۔ یہ معمولی مفروضات بالآخر ایک قابل ذکر اصلاح کے موجب ہوئے جس کی پیچیدگیوں کو (جو صدیوں کے عمل کے بعد مبالغہ آمیز حد تک بڑھ گئی تھیں) صرف معدودے چند ماہرین ہی سمجھ پائے۔ انھیں میں اجمالاً یہاں بیان کرنے کی کوشش کروں گا، علامتی انداز میں ہی سہی۔

ہم اولین قرعہ اندازی کا تصور کرتے ہیں جس نے ایک شخص کی موت کا فیصلہ کیا۔ اس حکم کی تعمیل کی غرض سے ایک دوسری قرعہ اندازی کروائی گئی جو (مثال کے طور پر) نو ممکنہ جلادوں کا نام تجویز کرتی ہے۔ ان جلادوں میں سے چار جلاد مزید ایک قرعہ اندازی کی تجویز پیش کرتے ہیں جو اصل جلاد کا نام تجویز کرے گی۔ دو جلاد اس ترکیب کو ایک خوش بخت قرعہ اندازی سے بدل سکتے ہیں (مثلاً وہ ایک خزانہ جیت سکتے ہیں۔) ایک دوسری قرعہ اندازی موت کی سزا کو مزید سنگین بنا سکتی ہے۔ جیسے یہی کہ اس کو مخفی بنا دیا جائے یا اس میں اذیت کاری کا اضافہ کیا جائے۔ کچھ احباب اس قرعہ اندازی کی تعمیل سے انکار کرسکتے ہیں۔ یہ علامتی صورت ہوگی۔ فی الحقیقت قرعہ اندازیوں کی تعداد لامحدود ہے۔ کوئی فیصلہ حتمی نہیں ہے، ہر فیصلہ دوسرے میں مدغم ہو جاتا ہے۔ بے علم افراد فرض کرلیتے ہیں کہ غیر محدود قرعہ اندازیوں کے واسطے غیر محدود وقت کی ضرورت ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ وقت کے لیے لامحدود انداز میں قابل تقسیم ہونا دشوار نہیں۔ یہی بات کچھوے کے ساتھ خرگوش کے مقابلے والی حکایت سے بھی مترشح ہے۔ یہ لامحدودیت قابل تحسین انداز میں اتفاقات کی تعداد اور قرعہ اندازی کی ساوی اصل سے ہم آہنگ ہے۔ افلاطونیت کے پیروکار اس مفروضے کے مدّاح تھے۔ ہماری رسومات کی ایک قدرے مدھم گونج ٹائبر کے کنارے پر بھی سنائی دیتی ہے۔

''انتونینس ہیلیو گیبلس کی حیات'' میں ایلس لامپریڈس ہمیں بتاتا ہے کہ یہ شہنشاہ گھونگوں کے خول

پر قرعے لکھتا تھا جن کی منزل بادشاہ کے اپنے مہمان ہوتے۔ اس طرح کسی نے سونے کے دس پاؤنڈ وصول کیے، کسی نے دس مکھیاں، گلہری سے مشابہ دس جان ور یا دس ریچھ پائے۔ ہیلیو گیبلس نے اسی نام کے دیوتا کے پروہتوں کے درمیان ایشیائے کوچک میں پرورش پائی تھی۔

غیر واضح مقصد کے تحت غیر شخصی قرعہ اندازیاں بھی ہوتی تھیں۔ ایک قرعہ اندازی فیصلہ صادر کرتی کہ 'ٹیروبین' کا ایک یاقوت ارزق فرات کے پانیوں میں پھینک دیا جائے۔ دوسری طے کرتی کہ ہر صدی کے بعد ساحل کے لاتعداد ریت کے ذرات میں سے ایک کی کمی یا اضافہ کر دیا جائے۔ ایک تیسری قرعہ اندازی فیصلہ کرتی کہ ایک پرندہ برج کی چوٹی سے آزاد کیا جائے۔ کبھی کبھار نتائج بہت خوف ناک ہوتے۔

کمپنی کے صالح اثر کے تحت ہمارے ریت رواج میں اتفاق کا دخل غیر معمولی حد تک بڑھ گیا۔ دمشق کی شراب سے بھرے دو دستیوں والے درجن بھر برتن خریدنے والا اس اتفاق پر متعجب نہ ہوتا، اگر اسے ان میں ایک دم دار انسان یا ایک سانپ ملے۔ معاہدوں کو رقم کرنے والا کاتب تقریباً ہمیشہ کچھ غلط معلومات لکھنے سے نہیں چوکتا۔ میں نے خود اس عاقبت نااندیشانہ بیان میں غلط طور پر ہی کچھ چمک دمک اور پاجی پن بڑھا دیا ہے۔ غالباً کچھ پر اسرار عدم تنوع بھی۔ ہمارے مورخین نے، جو دنیا کے سب سے بڑے دانش مند ہیں، 'اتفاق' کی اصلاح کے لیے ایک طریقہ کار وضع کیا ہے۔ یہ سبھی جانتے ہیں کہ اس طریقہ کار کا اطلاق (عمومی طور پر) قابل اعتبار ہے۔ اگرچہ قدرتی طور پر اسے کسی حد تک فریب دہی کے بغیر افشا نہیں کیا جاتا۔ بہ ہر صورت کمپنی کی تاریخ سے بڑھ کر کوئی دوسری شے اس قدر افسانویت سے مملو نہیں ہے۔ ایک معبد سے کھود کر نکالی گئی قدیم ترین زبان کی دستاویز کل ہونے والی قرعہ اندازی کا نتیجہ ہو سکتی ہے اور مدتوں پرانی ہونے والی قرعہ اندازی کا بھی۔ کوئی کتاب ایسی شائع نہیں ہوتی جس کی ہر جلد میں کچھ نہ کچھ فرق پیدا نہ کیا گیا ہو۔ کاتبین ان کتابوں میں فروگزاشت کرنے، اضافہ کرنے اور انھیں بدلنے کا خفیہ طور پر حلف اٹھاتے ہیں۔ یوں بالواسطہ جھوٹ کو بھی فروغ ملا۔

اپنی الہامی انکساری کے سبب کمپنی ہر طرح کی تشہیر بازی سے احتراز کرتی ہے۔ فطری امر ہے کہ اس کے گماشتے ہم سے مخفی ہیں۔ جو فرامین وہ اکثر و بیش تر جاری کرتے ہیں، وہ ٹھگوں کے جاری کردہ متعدد جعلی احکامات سے مختلف نہیں ہوتے۔ ایک شرابی جو کسی وقت ایک لغو فیصلہ صادر کرتا ہے۔ ایک خواب دیکھنے والا جو اچانک بیدار ہوتا اور اپنے پہلو میں لیٹی عورت کا گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کر دیتا ہے۔ تو کیا دونوں کمپنی ہی کے کسی خفیہ فیصلے کی تعمیل نہیں کر رہے ہوتے؟ خدائی کار پردازی کے مقابل یہ خاموش

فعلیت ہر طرح کے قیاس کو جنم دیتی ہے۔ایک قیاس کراہت انگیز انداز میں اس طرف بامعنی اشارہ کرتا ہے کہ کمپنی کی عمر چند صدیوں سے زیادہ نہیں ہے۔ ہماری زندگیوں کی مقدس بدنظمی خالصتاً موروثی اور روایتی ہے۔کسی کا خیال ہے یہ کمپنی ازلی ہےاور دنیا کی آخری رات تک باقی رہے گی یعنی جب آخری دیوتا دنیا کو معدوم کرے گا۔ کسی کا کہنا یہ ہے کہ کمپنی قادرِ مطلق ہے۔لیکن یہ محض ادنیٰ اشیا پر اثر انداز ہوتی ہے جیسے ایک پرندے کی صدا، گرد کی دھندلاہٹ، علی الصبح کے ادھورے خواب۔ایک دوسرا قیاس نقاب پوش ملحدوں کے الفاظ میں یہ ہے کہ یہ کبھی موجود نہیں تھی۔ نہ کبھی وجود میں آئے گی۔کوئی خباثت سے دلیل دیتا ہے کہ اس مبہم جماعت کی حقیقت سے انکار یا اثبات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیوں کہ بابل بہ جائے خود اتفاق کے ایک لامحدود کھیل کے سوا اور کچھ نہیں۔

انتظار

ٹیکسی نے اسے بیونس ایریز کے شمال مغربی حصے میں ایک گلی میں چار ہزار چار نمبر گھر کے سامنے اتارا۔ابھی صبح کے نو نہیں بجے تھے۔آدمی نے داغ دار چنار کے درختوں، ان درختوں کے تلے زمین کے مربع قطعوں، مختصر چھجوں والے باوقار گھروں، برابر ہی موجود دواخانے اور روغن اور تعمیراتی سامان کی دکان کی کھڑکیوں کے مانند پڑے شیشوں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ ہسپتال کی بے دریچہ طویل دیوار گلی کی دوسری جانب فٹ پاتھ کے عقب میں ایستادہ تھی۔اس سے آگے سورج کی شعاعیں پودوں کے شیشہ گھروں سے منعکس ہو رہی تھیں۔آدمی نے سوچا یہ چیزیں 'جواب بے قاعدہ' اتفاقی اور بغیر کسی تنظیم کے معلوم ہوتی ہیں' جیسا کہ خواب میں اکثر دکھائی دیتا ہے' اگر خدا نے چاہا تو کسی وقت یہی سب کچھ اس کے لیے ناقابل تغیر، ناگزیر اور مانوس ہو جائے گا۔

دواخانے کی کھڑکی پر چینی مٹی سے لکھے گئے حروف ''بریسلیئر'' کا لفظ بناتے تھے۔ یہودی اطالویوں کی جگہ لے رہے تھے جیسے کبھی اطالویوں نے 'کریولوں' کو راستے سے ہٹایا تھا۔تاریخ میں یوں ہی ہوتا ہے۔اس نے سوچا اپنے جیسے لوگوں سے نہ ہی ملا جائے تو بہتر ہے۔

ٹیکسی والے نے صندوق نیچے اتارنے میں اس کی مدد کی۔ایک عورت نے' جو پریشان یا تھکی ہوئی نظر آ رہی تھی' دروازہ کھولا۔اپنی نشست پر بیٹھے بیٹھے ٹیکسی والے نے اسے ان چند سکوں میں سے یوراگوئے کا بیس سینٹو کا سکہ واپس کیا جو اسی رات میلو کے ہوٹل میں اسے ملے تھے اور تب سے اس کی جیب میں پڑے

تھے۔ آدمی نے اسے چالیس سینٹو دیے اور خود سے کہا" مجھے کچھ ایسا کرنا چاہیے کہ کبھی مجھے معاف کر دیں۔ میں دو غلطیاں کر چکا ہوں۔ میں نے ایک غیر ملکی سکہ استعمال کیا اور پھر فوراً ہی اپنے تاثر سے اپنی غلطی کا اعتراف بھی کر لیا۔"

عورت کی رہ نمائی میں آگے بڑھتے ہوئے وہ ایک داخلی ہال اور صحن میں سے گزرا۔ جو کمرہ اس کے لیے مختص کیا گیا تھا' اس کا دروازہ ایک دوسرے صحن میں کھلتا تھا۔ کمرے میں موجود چار پائی لوہے کی بنی ہوئی تھی۔ ایک دست کار نے اس کی شکل، عجیب و غریب لہریے ڈال کر، جو شاخوں اور بیلوں کے نرم گچھوں جیسے لگ رہے تھے، بگاڑ دی تھی۔ کمرے میں صنوبر کی لکڑی کی ایک بلند قامت الماری، بستر کے برابر پڑی میز، کتابوں سے لدی ہوئی ایک فرشی شیلف، دو عجیب طرز کی کرسیاں اور گدلے کانچ کی بوتل، صابن دانی، مرتبان اور بیسن والا منہ ہاتھ دھونے کا سٹینڈ بھی موجود تھا۔

مصلوب عیسیٰ کی تصویر اور بیونس ایریز کے صوبے کا نقشہ اور دیواروں پر آویزاں تھے۔ دیواری کاغذ قرمزی رنگ کا تھا جس پر پھیلی ہوئی دموں والے بڑے بڑے موروں کے خاکے بنے ہوئے تھے۔ کمرے کا واحد دروازہ صحن میں کھلتا تھا۔ صندوق کو اندر رکھنے کے لیے کرسیوں کی جگہ تبدیل کرنے کی ضرورت تھی۔ اسے اجازت دے دی گئی کہ وہ اپنی مرضی سے فرنیچر کی ترتیب بدل سکتا تھا۔ عورت نے اس سے نام پوچھا تو اس نے جواب دیا" ویلری۔" یہ نام اس نے اس لیے نہیں لیا تھا کہ اس نے اس سوال کو اپنے لیے ایک خفیہ چیلنج سمجھا تھا۔ نہ اس لیے کہ اسے اس سوال سے تذلیل کا احساس ہوا تھا۔ بل کہ صرف اس لیے کہ یہ نام اسے الجھن میں مبتلا کر رہا تھا اور اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور نام کے بارے میں سوچ سکے۔ نہ ہی اس کا یہ مطلب تھا کہ اس نے اپنے دشمن کا نام کسی زیرک حکمت عملی کے تحت لیا تھا۔

پہلے پہل ویلری گھر سے بالکل باہر نہ نکلا۔ چند ہفتوں بعد اس نے غروب آفتاب کے وقت کچھ دیر باہر چہل قدمی کی عادت اختیار کی۔ ایک رات وہ تین بلاک کے فاصلے پر موجود ایک سینما گھر میں گیا۔ وہ کبھی نشستوں کی آخری قطار سے آگے نہ بڑھا اور ہمیشہ فلم کے اختتام سے کچھ دیر پہلے اٹھ آتا۔ اسے جرائم پیشہ لوگوں کی کہانیوں پر مبنی فلمیں دیکھنے کا شوق تھا۔ ان کہانیوں میں بلاشبہ اغلاط ہوتی تھیں۔ یہ کہانیاں ایسے واقعات پر مشتمل ہوتی تھیں جو اس کی اپنی زندگی سے مماثلت رکھتے تھے۔ لیکن ویلری کے لیے یہ بات زیادہ اہم نہیں تھی۔ اس کے نزدیک فن اور حقیقت دو مختلف باتیں تھیں۔ وہ منفعل انداز میں ان فلموں کی جزئیات میں دل چسپی لیتا۔ وہ اسی طرح سوچنے کی کوشش کرتا جیسا فلم میں انھیں دکھایا جاتا۔ ناول

پڑھنے والوں کے برعکس اس نے کبھی خود کو کسی فن پارے کا کردار تصور نہیں کیا۔
کوئی خط حتیٰ کہ کوئی گشتی چٹھی بھی کبھی اس کے نام نہیں آئی۔ لیکن مبہم امید کے سہارے وہ اخبار کے کالموں کو بہ غور پڑھتا۔ سہ پہر کو وہ کرسی دروازے کے پاس بچھالیتا۔ متانت کے ساتھ اپنا 'ماتے' بناتا اور پیتا۔ اس کی نگاہیں پاس ہی موجود متعدد منزلوں والی عمارت کی دیوار پر پھیلی انگور کی بیل پر جمی رہتی۔ تنہائی کے برسوں نے اسے سکھایا تھا کہ انسان کی یادداشت میں سبھی دن ایک جیسے ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی ایک دن بھی ایسا نہیں ہوتا' چاہے وہ عقوبت خانہ میں گزرے یا ہسپتال میں' کہ جو حیرتوں سے بھرا ہوا اور جو چھوٹی چھوٹی حیرتوں کے ایک شفاف جال پر مشتمل نہ ہو۔
سابقہ اسیری کے دوران وہ خود کو دنوں اور گھنٹوں کے شمار جیسے مشغلے میں مصروف رکھتے۔ لیکن یہ اسیری کچھ اور طرح کی تھی۔ اس کا کوئی اختتام نہیں تھا۔ تاوقتِ کہ ایک صبح اخبار میں ایلی جندر وویلری کی موت کی خبر شائع ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ویلری پہلے ہی مر چکا ہو۔ اس صورت میں یہ زندگی ایک خواب تھی۔ اس امکان کا تصور اسے الجھن میں ڈال دیتا کیوں کہ وہ کبھی صحیح طور پر نہیں جان سکا تھا کہ کیا یہ بات باعث اطمینان تھی یا باعث ندامت۔ اس نے خود کو سمجھایا کہ یہ سب کچھ لغو تھا۔ مدتوں پہلے اس نے بے محابا جوش کے ساتھ بہت سی چیزوں کی آرزو کی تھی۔ ان گئے دنوں میں جواتنے پرانے نہ لگتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ اس سے دوتین حرکتیں ایسی سرزد ہوئی تھیں جن کی تلافی ممکن نہیں تھی بل کہ اس لیے کہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس کا طاقت وارارادہ جس نے چند مردوں میں نفرت اور چند عورتوں میں محبت کو ابھارا تھا' اب کسی خاص شے کا متمنی نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ یہ سب کچھ اب فنا نہیں ہونا چاہیے۔ وہ زندگی کو گوارا بنانا چاہتا تھا۔ ماتے کا ذائقہ، سیاہ تمباکو کا تلذذ، صحن کو بہ تدریج ڈھانپتی بڑھتے سایوں کی قطار۔ اس کے لیے یہ محرکات کافی تھے۔
گھر میں ایک بھیڑیا نما کتا بھی تھا جو اَب بوڑھا ہو چکا تھا۔ ویلری نے اس سے دوستی گانٹھ لی۔ وہ اس سے ہسپانوی، اطالوی اور بچپن کی دیہاتی بولی کے، یادداشت میں باقی بچ رہنے والے، الفاظ میں گفت گو کرتا تھا۔ ویلری حال میں زندہ رہنے کی کوشش کرتا' ایسا حال جس میں نہ یادیں ہوں اور نہ توقعات۔ توقعات کی پھر بھی کچھ اہمیت تھی۔ لیکن یادوں کی اتنی بھی نہیں۔ مبہم انداز میں اس نے سوچا کہ وہ جانتا ہے ماضی ہی وہ شے ہے جس سے وقت تشکیل پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وقت فوراً ہی ماضی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ کبھی اس کی اکتاہٹ قناعت کے احساس میں بدل جاتی۔ ان لمحوں میں وہ خود کو ایک کتے سے بھی کم پیچیدہ محسوس کرتا تھا۔
ایک رات وہ اپنے منہ کے پچھلے حصے میں جانی پہچانی تکلیف کی لہر پرشش درره گیا اور کانپتے ہوئے

اٹھ بیٹھا۔ یہ ہول ناک معجزہ چند منٹوں میں دوبارہ رونما ہوا اور پھر علی الصبح اس کا ظہور ہوا۔ اگلے دن ویلری نے ایک ٹیکسی منگوائی جس نے اسے ایک دندان ساز کے مطب پر اتارا۔ اسے اپنا دانت نکلوانا پڑا۔ جسمانی اذیت کے ان لمحوں میں اس نے دوسرے لوگوں کی طرح نہ ہی زیادہ بزدلی کا مظاہرہ کیا اور نہ زیادہ بہادری کا۔

ایک رات فلم سے لوٹتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ کوئی اسے پیچھے سے دھکیل رہا تھا۔ غصے، نفرت اور داخلی طمانیت کے ساتھ وہ اس گستاخ شخص کی طرف مڑا اور اسے ایک ننگی گالی دی۔ دوسرے آدمی نے حیران ہوتے اور ہکلاتے ہوئے معذرت طلب کی۔ وہ ایک دراز قد، جوان اور سیاہ بالوں والا شخص تھا۔ اس کے ہم راہ ایک عورت تھی جو جرمن معلوم ہوتی تھی۔ اس رات ویلری نے خود سے بار بار کہا کہ وہ انھیں نہیں جانتا۔ تاہم اگلے چار پانچ دن وہ باہر گلی میں نہ نکلا۔

شیلف پر دھری کتابوں میں Divine Comedy موجود تھی جس میں اینڈریولی کی شرح بھی شامل تھی۔ تجسس کے تحت نہیں بل کہ ایک طرح کی ذمہ داری کے احساس کے ساتھ ویلری نے اس بڑے فن پارے کا مطالعہ شروع کیا۔ طعام سے قبل وہ ایک کینٹو پڑھتا اور پھر سخت پابندی کے ساتھ شرح کا مطالعہ کرتا۔ اسے جہنم کی سزائیں ناقابلِ یقین یا زائد از ضرورت محسوس نہیں ہوئیں۔ نہ اس نے اس بارے میں سوچا کہ دانتے ضرور اسے مجرم قرار دیتے ہوئے جہنم کے آخری طبقے میں پھینکنے کی سزا دیتا جہاں یوگولینو کے دانت مسلسل روگری کی گردن کو چبائے چلے جاتے ہیں۔

قرمزی دیواری کاغذ پر بنے مور پچھانہ چھوڑنے والے ڈراؤنے خوابوں کا خام مواد بن سکتے تھے۔ لیکن ویلری نے کبھی ایسے دیوہیکل 'کنج' کا خواب نہیں دیکھا جو گنجلک انداز میں زندہ پرندوں سے بنا گیا ہو۔ اس کی بہ جائے وہ علی الصبح ایک خواب دیکھتا جس میں بہ ظاہر محل وقوع بدل جاتا لیکن باقی سارا خواب وہی رہتا۔

ان خوابوں میں دو آدمی ویلری کے کمرے میں پستول لیے داخل ہوتے یا وہ اس پر تب حملہ آور ہوتے جب وہ سینما سے باہر نکلتا یا وہ تینوں بہ یک وقت وہی اجنبی ہوتے جس نے اسے دھکا دیا تھا یا وہ اداسی کے ساتھ صحن میں ان کا انتظار کرتا اور یوں معلوم ہوتا کہ وہ انھیں نہیں پہچانتا تھا۔ خواب کے آخر میں وہ بستر کے پہلو میں دھرے میز کے دراز میں سے اپنا پستول نکالتا (اور یہ سچ تھا کہ وہ اسی دراز میں اپنا پستول رکھتا تھا) اور ان آدمیوں پر گولی چلا دیتا۔ ہتھیار کے چلنے کی آواز اسے جگاتی لیکن وہ ہمیشہ ایک خواب ہوتا اور پھر ایک تیسرے خواب میں اسے انھی آدمیوں کو پھر سے قتل کرنا پڑتا۔

جولائی کے مہینے کی ایک کہر آلود صبح اجنبی لوگوں کی موجودگی نے (دروازے کی آواز نے نہیں)

اسے بیدار کیا۔ کمرے کے سایوں میں وہ دراز قد دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن انھی سایوں نے انھیں عجیب انداز میں سادہ بھی بنا دیا تھا۔ جب کہ ڈراؤنے خوابوں میں وہ ہمیشہ واضح دکھائی دیتے۔ وہ چوکس، ساکت اور مطمئن تھا اور نظریں جھکائے ہوئے تھا جیسے وہ ان کے ہتھیاروں کا بار نہ سہار پا رہی ہوں۔ اینلیچند رو ویلری اور ایک اجنبی نے آخر اس پر غلبہ پا لیا۔ ہاتھ کے اشارے سے ویلری نے انھیں انتظار کرنے کو کہا اور اپنا چہرہ دیوار کی طرف کر لیا۔ جیسے اپنی نیند کی کیفیت کو پھر سے خود پر طاری کر لینا چاہتا ہو۔ کیا ایسا اس نے ان لوگوں کی ہم دردی حاصل کرنے کے لیے کیا تھا جنھوں نے اسے بعد ازاں قتل کر دیا یا پھر اس لیے کہ ایک دہشت انگیز واقعہ کو برداشت کرنا مشکل ہے، اس کو تصور کرنے اور اس کا غیر مختتم انداز میں انتظار کرنے سے۔ یا پھر شاید اس لیے اور یہ بات زیادہ قرین قیاس بھی تھی کہ وہ سب کچھ خواب ہی کا حصہ تھا۔ کیوں کہ وہ پہلے بھی کتنی ہی بار اسی جگہ اسی وقت یہ سب کچھ کر چکا تھا۔

ویلری اسی طلسمی عمل کی گرفت میں تھا جب دھماکے نے اسے موت کی نیند سلا دیا۔

ایک لافانی انسان کی رُو داد

'سلیمان نے کہا 'زمین پر کوئی شے نئی نہیں ہے۔' افلاطون نے ایک ایسا ہی مفروضہ پیش کیا کہ تمام علم بازیافت ہی کی ایک صورت ہے۔ سلیمان کا نظریہ تھا کہ تمام انوکھا پن نسیان کے سوا کچھ نہیں۔' (فرانسس بیکن۔ مضامین VIII)

لندن میں جون ۱۹۲۹ء کے ابتدائی عشرے میں سمیرنا کے قدیم نوادرات کے ایک بیوپاری جوزف کارٹافیلس نے لوسنج کی شہزادی کے حضور پوپ (۱۷۱۵ء تا ۱۷۲۰ء) کی 'الیڈ' کی کاغذ کے چوتھائی حصے جتنے حجم کی چھ جلدیں پیش کیں۔ شہزادی نے کتابیں وصول کیں۔ کتابیں لینے کے بعد اس نے بیوپاری سے چند الفاظ کا تبادلہ کیا۔ شہزادی ہی سے ہمیں معلوم ہوا کہ وہ ایک غیر دل چسپ اور خستہ حال انسان تھا، بھوری آنکھوں اور بھوری داڑھی اور عجیب حد تک مبہم نقوش والا۔ وہ روانی اور بے نیازی کے ساتھ متعدد زبانوں میں اظہار مدعا کر سکتا تھا۔ محض چند منٹوں میں وہ فرانسیسی سے انگریزی میں پہلو بدلتا اور پھر انگریزی سے سالونیکا ہسپانوی اور میکاؤ، پرتگیزی کی ملی جلی ایک معماتی تلازماتی زبان بولنے لگتا۔ اکتوبر میں شہزادی کو زیوس کے ایک زائر سے معلوم ہوا کہ کارٹافیلس سمیرنا لوٹتے ہوئے بحری سفر کے دوران فوت ہو گیا۔

اسے آئیوس کے جزیرے پر ہی دفنا دیا گیا۔ ایلیڈ کی آخری جلد میں شہزادی کو یہ مسودہ دست یاب ہوا۔
اصلی مسودہ انگریزی میں لکھا گیا اور لاطینی محاوروں سے مزین تھا۔ جو ترجمہ یہاں پیش کیا جارہا ہے وہ حرف بہ حرف کیا گیا ہے۔

(۱)

جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے میری مشقتوں کا آغاز تھیبز ہیکاٹامپائیلس کے ایک باغ سے ہوا جب ڈائیوکلیشین مسند اقتدار پر جلوہ افروز تھا۔ مجھے اس پر کوئی فخر نہیں ہے کہ میں حالیہ مصری جنگوں میں لڑائیوں میں بیرینس میں چار حصوں میں منقسم ایک لیجن دستے، جسے سرخ سمندر کا سامنا تھا، کا افسر تھا۔ بخار اور جادو نے بہت سے جوانوں کو نگل لیا جنھوں نے مال غنیمت کی طمع میں بلند حوصلگی سے پیش قدمی کی تھی۔ موریطانیہ کے لوگ فتح یاب ہوئے۔ وہ سرزمین جو پہلے باغیوں کے تسلط میں تھی، ہمیشہ کے لیے پلوطانی دیوتاؤں سے منسوب ہوگئی۔ اس محرومی نے مجھے مبتلائے اذیت رکھا اور شاید یہی سبب تھا کہ میں خاموشی سے ہولناک اور منتشر صحراؤں سے پرے لافانی انسانوں کے خفیہ شہر کی دریافت کی مہم پر نکل پڑا۔
میں بیان کر چکا ہوں کہ میری مشقتوں کا آغاز تھیبز میں ایک باغ میں ہوا۔ اس رات میں سو نہیں سکا کیوں کہ کوئی بات میرے دل میں ہنگامہ برپا کیے ہوئے تھی۔ میں سورج نکلنے سے کچھ دیر پہلے بیدار ہوا۔ میرے غلام سو رہے تھے۔ چاند کا ویسا ہی رنگ تھا جیسا لامحدود صحرا کا تھا۔ ایک پژمردہ اور خون آلود گھڑسوار مشرق کی سمت سے آیا۔ مجھ سے چند قدموں کے فاصلے پر وہ گھوڑے پر سے نیچے گر پڑا۔ ایک نقاہت آمیز اور غیر تسکین پذیر آواز میں اس نے لاطینی زبان میں اس دریا کا نام پوچھا جو شہر کی دیواروں کے ساتھ ساتھ بہتا تھا۔ میں نے جواب دیا کہ یہ مصر کا دریا ہے جو بارش کے پانی سے بھر جاتا ہے۔
''میں جس دریا کی کھوج میں ہوں وہ کوئی اور ہے۔'' اس نے یاس کے ساتھ جواب دیا ''وہ مخفی دریا جو انسان کو موت کی بندش سے مکت کر دیتا ہے۔'' خون اس کی چھاتی سے تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کا آبائی قصبہ گینگو کے دوسری جانب ایک پہاڑ پر واقع ہے۔ اس پہاڑ کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ اگر کوئی اس پر مغرب کی طرف سفر کرے جہاں دنیا ختم ہو جاتی ہے تو وہ اس دریا تک پہنچ جائے گا جس کا پانی حیات جاوداں عطا کرتا ہے۔ اس نے مزید بتایا کہ دریا کے دور دراز کنارے پر لافانی انسانوں کا شہر آباد ہے جو برجوں، دائروی تماشا گاہوں اور مندروں سے مزین ہے۔ صبح تک وہ مر گیا۔ میں نے اس شہر اور اس دریا کو دریافت کرنے کا مصمم ارادہ کیا۔ جلاد نے تفتیش کی تو موریطانیہ کے چند قیدیوں نے مسافر کی اس داستان کی تصدیق بھی کی۔

ایک شخص کو ایا ئیسین کا میدان یاد تھا جو زمین کے آخر میں واقع ہے اور جہاں موجود انسانوں کی زندگیاں لافانی ہیں۔ ایک دوسرے شخص کو وہ چوٹیاں بھی یاد تھیں جہاں پا کٹوکس شہر آباد ہے جس کے باشندے ایک ایک صدی تک زندہ رہتے ہیں۔ روم میں مجھے فلاسفہ سے مباحث کا موقع ملا جن کا خیال تھا کہ انسانی زندگی بڑھانے کا مطلب اس کی روحانی اذیت میں اضافہ کرنا اور جسم کی اموات کو کئی چند کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں کبھی لافانی انسانوں کے شہر پر اپنا یقین قائم کر پاؤں گا یا نہیں۔ میں سوچتا تھا کہ اس کو ڈھونڈنے کی کاوش ہی کافی تھی۔ گیٹولیا کے صوبے دار فلاویس نے اس مہم کے لیے دوسو سپاہیوں کا دستہ میرے ہم راہ کیا۔ میں نے چند بھاڑے کے سپاہی بھی ساتھ لیے جن کا دعویٰ تھا کہ وہ تمام راستوں سے واقف تھے۔ انھی سپاہیوں نے سب سے پہلے ہمارا ساتھ چھوڑا۔

بعد کے واقعات نے لاینحل انداز میں ہمارے سفر کے ابتدائی ایام کی یادداشت کو محو کر دیا۔ ہم آرسینو سے گزر کر جھلتے صحرا میں داخل ہوئے۔ ہم گوشہ نشینوں کے خطے میں سے گزرے جو سانپوں کو نگل جاتے اور باہمی لسانی رابطے سے نا آشنا تھے۔ گارافیٹز کے شہر سے ہوتے ہوئے جو اپنی عورتوں کا اشتراک کرتے اور شیروں کا گوشت کھاتے تھے، ہم آیوگائلوں کے شہر گئے جو ٹارٹرس کی پوجا کرتے تھے۔ ہم مختلف صحراؤں میں مارے مارے پھرے جہاں ریت سیاہ رنگ کی تھی، جہاں مسافر رات کے وقت سفر کرتے تھے کیوں کہ وہاں دن کی حرارت نا قابل برداشت تھی۔

ایک مقام پر میں نے دور ایک پہاڑ کی جھلک دیکھی۔ اس کے دامن میں سپرج کے دودھیا رس والے پودے تھے جو تریاق کا جوہر رکھتے ہیں۔ اس کی چوٹی پر ساطر رہتے تھے، ایک قوم جو کٹھور اور وحشی انسانوں پر مشتمل اور شہوت پرستی میں مبتلا تھی۔ ان وحشیانہ خطوں میں جہاں زمین عفریتوں کی ماں ہے، ایک معروف شہر پنہاں تھا جو ہم سب کو نا قابل ادراک معلوم ہوا۔ ہم نے اپنا سفر جاری رکھا کیوں کہ اب واپسی کا سوچنا بھی محال تھا۔ چند نا سمجھ لوگ چاند کے رخ پر اپنے چہرے موڑ کر سو گئے۔ بخار نے انھیں جلا ڈالا۔ حوض کے نجس پانی سے باقیوں نے پاگل پن اور موت کا زہر پی لیا۔ تب فرار کا عمل شروع ہوا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں غدر مچ گیا۔ انھیں قابو میں رکھنے کے لیے میں نے بلاتردد سفاکانہ رویہ اپنایا۔ تاہم میں نے انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ایک فوجی کپتان نے مجھے متنبہ کیا کہ باغی (جو اپنے ایک رفیق کو قتل کیے جانے پر انتقام کی آگ میں جل رہے تھے) میرے قتل کی سازش تیار کر رہے تھے۔ میں پڑاؤ سے اپنے چند وفادار سپاہیوں کے ساتھ فرار ہو گیا۔ لیکن میں انھیں ایک صحرائی طوفان اور اندھی رات کے بیچ کہیں کھو بیٹھا۔ کریٹسن قبیلے والوں کے ایک تیر نے مجھے زخمی کیا۔ میں کئی دن پانی کی تلاش میں بھٹکتا رہا یا

پھر وہ بس ایک ہی دن تھا جسے سورج نے یا میری پیاس یا میری پیاس کے خوف نے کئی چند کر دیا تھا۔ میں نے اپنے راستے کا انتخاب کلیتاً اپنے گھوڑے کی سمجھ بوجھ پر چھوڑ دیا۔ علی الصبح مجھے دور معبدوں اور میناروں کا جھنڈ دکھائی دیا۔ بے چینی کے ساتھ میں نے ایک خفیف اور روشن بھول بھلیوں کا خواب دیکھا۔ عین وسط میں پانی کا مرتبان دھرا تھا۔ میرے ہاتھوں نے اسے چھوا، میری آنکھیں اسے دیکھ سکتی تھیں لیکن لہردار راستے اس قدر الجھے ہوئے اور پیچیدہ تھے کہ میں جان گیا کہ اس تک پہنچنے سے پہلے میں مر جاؤں گا۔

(ب)

میں اس ڈراؤنے خواب کے الجھاؤ سے نکلا تو میں نے خود کو بندھے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ پتھر کے ایک مستطیل طاقچے میں لیٹے ہوئے پایا جو ایک عمومی قبر سے زیادہ بڑا نہیں تھا اور جو ایک پہاڑ کی سنگین ڈھلوان میں کھوکھلی جگہ میں بنایا گیا تھا۔ اس کی دیواریں سیلن زدہ تھیں جسے انسانی ہاتھوں کی بہ جائے وقت کے سیل نے ہموار کیا تھا۔ مجھے اپنے سینے میں پر اذیت ٹیس محسوس ہوئی اور احساس ہوا کہ میں پیاس سے جھلس رہا ہوں۔ میں نے باہر دیکھا۔ میں نحیف آواز میں چلایا۔ پہاڑ کے دامن میں ایک آلودہ پانی کی جھیل خاموشی سے ملبے اور ریت سے مزاحم ہوتی بہ رہی تھی۔ دوسرے کنارے پر (آخری سورج یا اولین سورج کے تلے) لافانی انسانوں کا بڑا شہر دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے دیواریں، محرابیں، عمارتوں کی پیشانیاں دیکھیں۔ ان کی بنیاد ایک سنگلاخ مرتفع میدان پر قائم تھی۔ میرے طاقچے سے مشابہ ایک سو سے زائد بے قاعدہ طاقچوں نے پہاڑ اور وادی کو شکن آلود کر رکھا تھا۔ ریت میں کھوکھلے گڑھے تھے۔ ان آفت خیز بلوں اور طاقچوں سے برہنہ، بھوری چمڑی اور لمبی داڑھیوں والے انسان نمودار ہوئے۔ مجھے لگا میں انھیں پہچانتا ہوں۔ یہ ان گوشہ نشینوں کی نجس نسل سے تھے جو بحیرہ عرب کے ساحلوں اور ایتھوپیا کی گپھاؤں میں بہ کثرت موجود تھے۔ میرے لیے یہ بات تعجب خیز نہیں تھی کہ یہ بول نہیں سکتے تھے اور سانپوں کو نگل جاتے تھے۔

میری پیاس کی شدت نے مجھے غیر محتاط بنا دیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ میں ریت سے قریب تیس فٹ کے فاصلے پر ہوں۔ میں نے خود کو سر کے بل ڈھلوان کے نیچے گرا لیا۔ میری آنکھیں بند تھیں اور ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے خون آلود چہرے کو سیاہ پانی میں ڈبو دیا اور یوں پانی پیا جیسے جانور پیتے ہیں۔ پھر نیند اور ہذیان میں مبتلا ہو جانے سے قبل میں نے یونانی زبان میں غیر واضح طور پر چند لفظ بولے ''زیلیا کے رئیس ٹروجن جنھوں نے ایسپوس کا سیاہ پانی پیا۔'' میں نہیں جانتا، کتنے دن اور راتیں مجھ پر سے گزر گئیں۔ درد سے کراہتے ہوئے، گپھا کے سائبان کے حصول نو سے قاصر، میں اجنبی

ریت پر برہنہ لیٹے ہوئے چاند اور سورج کو میری قسمت سے کھلواڑ کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ گوشہ نشینوں نے جو اپنی وحشت میں بالکل طفلانہ حرکتیں کر رہے تھے، میرے زندہ رہنے یا مرجانے میں کوئی مدد نہیں کی۔ میں نے بے کار ہی ان سے استدعا کی کہ وہ مجھے مار دیں۔ ایک روز میں نے چقماق کے پتھر کی نوک سے اپنی رسیوں کو کاٹ ڈالا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اپنے التجا یا چوری کرنے کے اہل تھا۔ میں روم کے لیجن کے دستے کا فوجی افسر، مارکیوس فلیمینیس روفوس، میں نے سانپ کے گوشت کا اپنا اولین قابل نفرت حصہ کھایا۔ غیر فانی انسانوں کو دیکھنے اور فوق الانسانی شہر کو چھونے کی حرص نے میری آنکھوں سے نیند چھین لی تھی۔ لگتا تھا وہ گوشہ نشین میرے مقصد کو بھانپ گئے تھے۔ کیوں کہ وہ بھی نہ سوئے۔ پہلے پہل میں نے قیاس کیا کہ وہ میری نگرانی کر رہے تھے۔ بعد ازاں سوچا کہ شاید میرے اضطراب سے ان کا دھیان بھر شٹ ہوا تھا۔ اس وحشی قصبے سے روانگی کے لیے میں نے ہنگامہ خیز وقت کا انتخاب کیا۔ شام کے آغاز پر سبھی لوگ اپنے شگافوں اور گڑھوں سے برآمد ہوتے اور غروب ہوتے سورج کی جانب دیکھتے۔ میں نے با آواز بلند عبادت کی۔ صرف الہامی خوش نودی کے حصول کے لیے نہیں بل کہ واضح انداز میں اس قبیلے پر لعن طعن کی۔

دو یا تین پراگندہ ذہن آدمیوں نے میرا تعاقب کیا۔ میں نے ریت کے ٹیلوں سے مزاحم ندی کو پار کیا اور شہر کی طرف ہولیا۔ وہ (اس نسل کے دیگر انسانوں کی مانند) دھان پان سے تھے۔ ان کے لیے مجھ میں خوف کی بہ جائے کراہت کا احساس پیدا ہوا۔ مجھے مختلف بے قاعدہ گھاٹیوں کے ساتھ ساتھ چلنا پڑا جو مجھے شکار گاہوں جیسی معلوم ہوئیں۔ شہر کی جاہ و حشمت سے متاثر ہوتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ یہ بالکل قریب ہی تو ہے۔ آدھی رات کے قریب میں نے اس کی دیواروں کے سیاہ سایوں پر قدم رکھا جو زرد ریت پر مختلف شبیہوں کی صورت میں ساکت تھے۔ میں ایک مقدس دہشت میں مبتلا ہو گیا۔ انوکھا پن اور صحرا انسان کے لیے اس قدر حقارت آمیز ہے کہ مجھے یہ بات مسرت بخش معلوم ہوئی کہ گوشہ نشینوں میں سے اب بھی کوئی میرے تعاقب میں تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں موند لیں اور (سوئے بغیر) دن کا اجالا پھیلنے کا انتظار کرنے لگا۔

میں بتا چکا ہوں کہ شہر کی بنیاد ایک پتھریلی سطح مرتفع پر قائم تھی۔ یہ سطح مرتفع ایک بلند چوٹی کی بہ جائے دیواروں کی طرح ڈھلوانی تھی۔ میں نے خود کو بے سود ہی تھکایا۔ سیاہ بنیادوں میں مجھے کوئی معمولی ترین رخنہ بھی نہ مل سکا اور نہ ہی اس کی ہموار دیواروں میں کوئی دروازہ تھا۔ سورج کی تپش نے مجھے ایک غار میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ اس کے اندر ایک گڑھا تھا۔ اس میں ایک زینہ نیچے تاریکی میں اتھاہ گہرائیوں میں اترتا دکھائی دیا۔ میں نیچے اترا۔ تنگ غلام گردش کے انتشار میں سے گزر کر میں ایک کشادہ دائروی

حجرے میں پہنچا جو بہ مشکل دکھائی دیتا تھا۔ کوٹھڑی میں نو دروازے تھے۔ آٹھ دروازے بھول بھلیوں میں کھلتے تھے جو مکارانہ انداز میں پھر سے اسی حجرے میں لوٹ آتی تھیں۔ نواں ایک اور طرح کی بھول بھلیوں میں کھلتا تھا جو دوسرے حجرے میں داخل ہو جاتی تھیں۔ میں ان حجروں کی کل تعداد سے لاعلم تھا۔ میری سیہ بختی اور گھبراہٹ نے انھیں کئی چند کر دیا۔ سناٹا گم راہ کن اور قاتل تھا۔ اس گہری پتھریلی جگہ پر کوئی آواز نہ تھی سوائے زیر زمین چلتی ہوا کی آواز کے جس کا منبع میں دریافت نہیں کر سکا۔ بہت خاموشی کے ساتھ گہرے بادامی رنگ کے پانی کی کتنی ہی جھیلیں ان گپھاؤں میں پوشیدہ تھیں۔ مسلسل دہشت کی حالت میں میں اس مشتبہ دنیا کا عادی ہو گیا۔ میں نے سوچا بھلا یہاں نو دروازوں اور دور دراز شاخ در شاخ پھیلی ہوئی کوٹھڑیوں کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ میں نہیں جانتا کہ زیر زمین دنیا میں میں کتنی دور تک گیا۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ میں نے یاد ماضی میں کھوئے ہوئے وحشیوں کے خبیث قصبے اور اس جم غفیر کے ساتھ اپنے آبائی شہر کو باہم الجھا دیا تھا۔

ایک غلام گردش کی گہرائیوں میں ایک غیر متوقع دیوار نے مجھے رکنے پر مجبور کیا۔ اوپر دور سے روشنی نیچے آ رہی تھی۔ میں نے اپنی ژولیدہ نگاہیں بلند کیں۔ گول گول چکر کھاتی ہوئی انتہائی بلندیوں پر مجھے آسمان کا حلقہ دکھائی دیا جو اتنا نیلا تھا کہ ارغوانی معلوم ہوتا تھا۔ چند آہنی سیڑھی کے ڈنڈوں نے دیوار کو برابر حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ میں تھکن سے لنگڑا رہا تھا لیکن میں اچک کر اوپر چڑھ گیا۔ وقفے وقفے سے مسرت کے ساتھ اناڑی پن سے سانس درست کرنے کو تھم جاتا۔ میں نے آرائشی حاشیوں، تکونی عمارتوں اور محرابوں، گرینائٹ اور سنگ مرمر کے پیچیدہ پرشکوہ منظروں کی جھلک دیکھی۔ میں باہم گندھی ہوئی تاریک بھول بھلیوں کے اندھے خطے سے نکل کر اس درخشاں شہر میں داخل ہوا اور ایک طرح کے مربع نما مختصر احاطے میں جا نکلا جو ایک صحن جیسا تھا یا اس کے گرداگرد بے قاعدہ ہیئت اور مختلف بلندی والی عمارت تھی۔ یہ مختلف الاضلاع عمارت متعدد گنبدوں اور ستونوں پر مشتمل تھی۔ اس غیر معمولی عمارت کی کسی دوسری خصوصیت کی نسبت اس کی قدامت نے مجھے متاثر کیا۔ مجھے لگا کہ یہ انسان اور زمین کی آفرینش سے بھی پہلے کی بنی ہوئی تھی۔ ان لافانی معماروں کی تعمیرات کی اتنی ہی قدامت ہونی چاہیے۔ اول اول احتیاط، بعد ازاں بے پرواہی اور پھر مایوسی کے ساتھ میں محل کی سیڑھیاں چڑھنے اور پختہ راستوں پر چلنے لگا۔ (بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ سیڑھیوں کی اونچائی اور چوڑائی برابر نہیں تھی۔ یہ ایسی حقیقت تھی جس نے مجھے میری غیر معمولی تھکن کو سمجھنے میں مدد دی جو اسی غیر ہمواری کے سبب پیدا ہوئی تھی۔)

''یہ محل دیوتاؤں کا وضع کردہ ایک مکر ہے۔'' میں نے ابتداً سوچا۔ اس غیر آباد زیر زمین دنیا میں سفر

کرنے کے بعد میں نے اپنے خیال کی اصلاح کی ''وہ دیوتا جنھوں نے اسے تعمیر کیا، مر چکے ہیں۔'' میں نے اس کے عجیب پہلوؤں پر غور کیا اور سوچا ''جن دیوتاؤں نے اسے تعمیر کیا، وہ پاگل تھے۔'' میں جانتا تھا کہ ایسا میں فقط اپنی نا قابلِ فہم نفرت کے باعث سوچ رہا تھا جو میری دہشت سے پیدا شدہ پچھتاوے کا نتیجہ تھی۔ اس کی سن رسیدگی سے میرے تاثر میں دیگر تاثرات شامل ہو گئے کہ یہ لامتناہی اور نجس ہے۔ یہ پیچیدہ طور پر بے حس شے تھی۔ میں نے بھول بھلیوں کے ایک سلسلے کو عبور کیا۔ لافانی انسانوں کے درخشاں شہر نے میرے اندر سراسیمگی اور مغائرت پیدا کی۔ بھول بھلیاں ایسی ترکیب ہے جو انسانی ذہن کو الجھا دیتی ہے۔ اس کا طرزِ تعمیر، جو انتہائی با قاعدہ ہوتا ہے، دراصل اسی مقصد کو پورا کرتا ہے۔ میں نے بے پروائی سے محل کا جائزہ لیا۔ مجھے اس طرزِ تعمیر میں ایسے کسی کمال کا فقدان نظر آیا۔ یہ محل مردہ غلام گردشوں، بلند نا قابلِ رسائی دریچوں، بدشگون دروازوں جو کسی کوٹھڑی یا گڑھے میں جا نکلتے ہیں اور غیر معمولی طور پر گڈمڈ زینوں سے بھرا ہوا تھا جن کی سیڑھیاں اور کٹہرے نیچے جھکے ہوئے تھے۔ اکثر زینے جو ایک عالی شان دیوار کے پہلو میں ہوا میں معلق تھے، گنبدوں کی اداس تاریکیوں میں دو یا تین چکر کاٹ کر کہیں بھی پہنچنے سے پہلے ختم ہو جاتے۔ میں نہیں جانتا کہ یہ تمام مناظر، جو میں نے یہاں بیان کیے، واقعی حقیقی ہیں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ کئی برس تک یہ میرے ڈراؤنے خوابوں کی ترکیب کا حصہ بنے رہے۔ میں ہنوز اس اہل نہیں ہو پایا ہوں کہ جان سکوں ان میں سے کون سی یاد حقیقی ہے اور کون سی جزئیات فرضی اشکال ہیں جنھوں نے میری راتوں کو بے مدار کیا۔

میں نے سوچا یہ شہر اس قدر ہولناک ہے کہ محض اس کا وجود اور اس کی پائے داری (ہر چند کہ یہ اس خفیہ صحرا کے وسط میں ایستادہ ہے) ماضی اور مستقبل کو نجس کرتی اور ایک اعتبار سے ستاروں کے وجود کے لیے ایک خطرہ ہے۔ جب تک یہ شہر موجود ہے، دنیا میں نہ کوئی طاقت ور بن سکتا ہے اور نہ مسرت ہی اسے میسر آئے گی۔ میں یہ روداد بیان کرنا نہیں چاہتا۔ الفاظ کا انتشار، ایک شیر یا ایک بھینسے کا جسم جس میں دانت، اعضائے رئیسہ اور سر باہمی تلازم کے نتیجے میں وحشیانہ انداز میں پھوٹ پڑے ہوں اور نفرت، غالباً اس مقصد کے لیے مناسب تراکیب اور تشبیہیں ہیں۔

مجھے واپسی کا سفر یاد نہیں ہے۔

میں نے گرد اور نم آلود زیرِ زمین راستے طے کیے۔ صرف اتنا علم ہے کہ میں اس سفر میں اس خوف میں مبتلا رہا کہ آخر آخر بھول بھلیوں میں سے نکل کر میں کہیں پھر سے واپس لافانی انسانوں کے گم راہ کن شہر میں نہ جا پھنسوں۔ اس کے سوا مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔ یہ نسیان، جو اَب نا قابلِ اصلاح ہے، شاید ارادی

تھا۔ غالباً میرے فرار کے حالات اس قدر ناخوش گوار اور ناساعد تھے کہ کسی روز، جسے میں ہنوز بھلا نہیں پایا، میں نے فیصلہ کیا کہ میں ان تمام یادوں کو فراموش کر دوں گا۔

(ج)

جنھوں نے میری مشقتوں کا حال توجہ سے پڑھا ہے، انھیں یاد ہوگا کہ اس قبیلے کے ایک فرد نے ایک کتے کی مانند دیواروں کے بے قاعدہ سایوں تک میرا تعاقب کیا تھا۔ جب میں آخری کوٹھڑی سے باہر نکلا، مجھے وہ غار کے دہانے پر دکھائی دیا۔ وہ ریت پر پھیلا ہوا تھا اور بھونڈے پن سے نشانات کی ایک زنجیر کا تعاقب کرتا انھیں مٹاتا جاتا تھا جو خوابوں میں دکھائی دینے والے حروف کی مانند تھے۔ یہ ایک لمحے کے لیے قابل فہم معلوم ہوتے تھے لیکن پھر فوراً ہی تحلیل ہو جاتے۔ ابتداً میں نے سوچا کہ شاید یہ قدیم ترین انسانی تحریر کا نمونہ ہیں لیکن مجھے یہ خیال لغو معلوم ہوا۔ کیوں کہ جو لوگ لفظ بولنے کے درجہ تک نہیں پہنچ پائے تھے، وہ لکھ کیا پائیں گے۔ ان میں سے کوئی نشان دوسرے جیسا نہیں تھا جس سے یہ امکان مسترد یا کم ہو گیا کہ وہ محض استعارے تھے۔ وہ آدمی ان کو کھوجتا، انھیں بہ غور دیکھتا اور ان میں ترمیم کرتا دفعتاً جیسے اس کھیل سے اوب گیا۔ اس نے انھیں اپنی ہتھیلی اور کلائی سے مٹا دیا۔ پھر میری جانب دیکھا۔ یوں لگا جیسے وہ مجھے پہچان نہیں پایا۔ تاہم میرے اندر ایک طرح کی شدید آسودگی اور طمانیت بھری ہوئی تھی یا میری تنہائی اس درجہ سنگین اور ہول ناک تھی کہ اس کی بنا پر میں نے فرض کر لیا کہ یہ غیر اہم گوشہ نشین، جو غار کے فرش پر لیٹا مجھے دیکھ رہا تھا، میرا ہی انتظار کھینچ رہا تھا۔ سورج نے زمین کو جھلسا دیا تھا۔ ہم نے آغاز شب کے ستاروں تلے گاؤں کی جانب واپسی کا آغاز کیا۔ ریت ہمارے پیروں کے تلوؤں کو جھلسا رہی تھی۔ گوشہ نشین آگے آگے تھا۔ اس رات میں نے سوچا کہ اسے چند الفاظ کو شناخت کرنا اور انھیں بولنا سکھاؤں گا۔ کتا اور گھوڑا، یہ میرا خیال ہے کہ یہ اس کام کے اہل ہیں اور کئی پرندے بھی جیسے سیزر کی بلبلیں وغیرہ۔ ایک انسان کا ذہن خواہ کس قدر خام ہو، بہ ہر حال ان بے عقل جان وروں سے برتر ہی ہے۔ اس فرومائیگی اور بے چارگی نے، جس کا میں نے اس گوشہ نشین میں ادراک کیا، میرے ذہن میں اوڈیسی کے جاں بہ لب بوڑھے کتے آرگس کی شبیہ کو تازہ کیا۔ اسی باعث میں نے اسے آرگس کا نام دیا اور اسے یہ نام سکھانے کی کوشش کی۔ بار بار مجھے ناکامی ہوئی۔ مصلحت پسندی، سخت گیری اور ہٹ دھرمی، سبھی کوششیں رائیگاں گئیں۔ بے حرکت اور بے جان آنکھوں کے ساتھ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے ان آوازوں کا ادراک بھی نہیں ہو پا رہا جو میں اس کو سکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

چند قدموں کے فاصلے پر وہ مجھے بہت دور کھڑا معلوم ہوا۔ شکستہ ''آئیوا'' کے تباہ حال چھوٹے

سفنکس کی مانند ریت پر لیٹے ہوئے وہ آسمانوں کو بدلتے دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ صبح کے جھٹپٹے کے بعد شام ہوگئی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میرے ارادے سے بے خبر تھا۔ مجھے یاد آیا ایتھوپیا کے باشندوں میں یہ مقولہ عام ہے کہ 'بندر شعوری طور پر صرف اس لیے نہیں بولتے مبادا انھیں کام کرنا پڑے۔' میں نے آرگس کی خاموشی کو شک یا خوف کے احساس سے تعبیر کیا۔ اس قیاس سے میں دوسرے قیاسات کی طرف راجع ہوا جو کہیں زیادہ غیر محتاط تھے۔ میں نے سوچا کہ آرگس اور میں مختلف کائناتوں کے باشندے ہیں۔ ہمارے مدرکات باہم مشابہ ضرور ہیں لیکن وہ انھیں ایک مختلف انداز میں یک جا کرتا اور ان سے کہیں مختلف اشیا کا تصور قائم کرتا تھا۔ میں نے سوچا شاید اس کے لیے کوئی شے موجود نہیں تھی۔ بل کہ یہ محض انتہائی مختصر محسوسات کا ایک مسلسل اور چکردار کھیل تھا۔

میں نے یادداشت اور وقت سے تہی ایک دنیا کو تصور کیا۔ میں نے اسما کے بغیر ایک زبان کے امکان کے بارے میں سوچا۔ ایک زبان جو غیر شخصی افعال اور غیر متصرف اوصاف پر مشتمل ہو۔ اس طور دن انجام پذیر ہوتے گئے اور ان کے ساتھ ساتھ سال بھی۔ لیکن ایک صبح ایک طرح کی مسرت سے مملو ایک واقعہ رونما ہوا، شدید ترین دھیمے پن کے ساتھ مینہ برسنے کا واقعہ۔

صحرا کی راتیں یخ ہوتی ہیں لیکن یہ رات آگ کی طرح گرم تھی۔ میں نے خواب دیکھا کہ تھیسلی کا ایک دریا (جس کے پانیوں میں میں نے ایک طلائی مچھلی ڈالی تھی) میری اعانت کے لیے آیا تھا۔ سرخ ریت اور سیاہ چٹان کے درمیان میں نے اسے قریب آتے سنا۔ ہوا کی یخ بستگی اور بارش کی مسلسل سرسراہٹ نے مجھے بیدار کیا۔ میں برہنہ حالت میں بھاگا۔ رات مدھم ہو رہی تھی۔ زرد بادلوں کے تلے قبیلے کے لوگوں نے، جو مجھ سے کم مسرور نہیں تھے، وجد کی کیفیت میں خود کو اس چمکیلی موسلا دھار بارش کے سپرد کر دیا۔ وہ کوریبنٹز کی مانند دکھائی دے رہے تھے جو الوہیت کے حصار میں آ چکے ہوں۔ آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائے ہوئے آرگس کراہنے لگا۔ پانی کی دھار اس کے چہرے پر بہہ رہی تھی۔ تاہم یہ صرف بارش کا پانی نہیں تھا بل کہ (جیسا مجھے بعد میں معلوم ہوا) اس کے آنسو بھی اس میں شامل تھے۔ ''آرگس'' میں پکارا ''آرگس۔''

مہربان ستائشی لہجے میں اس نے کوئی ایسی شے دریافت کی جسے وہ مدت پہلے کھو چکا اور فراموش کر چکا تھا۔ آرگس نے ہکلاتے ہوئے یہ الفاظ ادا کیے ''آرگس یولیسز کتا،'' اور پھر میری طرف دیکھے بغیر بولا ''یہ کتا گوبر میں لیٹا ہوا ہے۔''

ہم حقیقت کو آسانی سے قبول کر لیتے ہیں۔ غالباً اس لیے کہ کسی طور وجدان ہو جاتا ہے کہ کچھ بھی

حقیقی نہیں ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ ''اوڈیسی'' کے متعلق کیا جانتا ہے۔ یونانی زبان کی ادائی اس کے لیے دشوار تھی۔ مجھے اپنا سوال دہرانا پڑا۔

''بہت کم'' اس نے کہا ''ایک انتہائی فرومایہ رجز گو سے بھی کم۔ اس بات کو کہ جب میں نے اس نظم کو تخلیق کیا تھا، قریب گیارہ سو برس بیت چکے ہیں۔''

(۵)

اس روز گویا ہر بات میری سمجھ میں آ گئی۔ یہ گوشہ نشین لافانی تھے۔ یہی وہ ریتلے پانیوں کا نالا تھا جس کی تلاش وہ گھڑسوار کر رہا تھا۔ اس شہر کو، جس کا شہرہ گینگو کی مانند دور دور تک پھیلا ہوا تھا، قریب نو سو برس قبل لافانی انسانوں نے منہدم کیا تھا۔ اس کے کھنڈرات کی باقیات سے انھوں نے اسی مقام پر یہ بے قاعدہ شہر تعمیر کیا جس کی میں سیاحت کر چکا تھا۔ یہ ایک طرح کی تظمین یا تقلیب تھی اور قریب قریب ان غیر معقول دیوتاؤں کا معبد بھی جو دنیا پر حکومت کرتے تھے اور جن کے بارے میں ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے کہ وہ انسان سے مشابہ نہیں تھے۔ یہ تعمیر وہ آخری علامت تھی جس کی طرف لافانی انسان راغب ہوئے۔ یہ علامت ان کی ذہنی کیفیت کی غماز تھی۔ اس تجزیے کے بعد کہ ہر شے بے سود ہے، انھوں نے خیال کی سطح اور خالص تصوراتی سطح پر زندہ رہنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے یہ عماراتی ڈھانچا کھڑا کیا۔ پھر اسے فراموش کر دیا اور غاروں میں چلے گئے۔ اپنے خیالات میں مستغرق ہو کر انھوں نے پھر شاذ ہی کبھی خارجی دنیا کا مشاہدہ کیا۔

یہ باتیں مجھے ہومر نے بتائی تھیں جیسے کوئی بچے کو سبق پڑھاتا ہے۔ اس نے مجھے اپنے بڑھاپے اور اپنے آخری سفر کی روداد بھی بیان کی جو یولیسز کی طرح اس مقصد کے تحت کیا گیا تھا کہ ان انسانوں تک رسائی حاصل کی جائے جو نہیں جانتے کہ سمندر کیسا مظہر ہے؟ جو نمک لگا ہوا گوشت نہیں کھاتے، نہ جنھیں یہ جاننے کا تجسس ہے کہ چپوار کسے کہتے ہیں؟ وہ لافانی انسانوں کے شہر میں سو سال تک رہا۔ جب اسے مسمار کیا گیا تو اس نے تجویز پیش کی کہ ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی جائے۔ یہ بات تعجب خیز نہیں ہے کیوں کہ یہ روایت مشہور ہے کہ لیون کی جنگ کا رجز گانے کے بعد اس نے مینڈکوں اور چوہوں کی جنگ کا رجز گایا۔ وہ اس دیوتا کی طرح تھا جس نے کائنات تخلیق کرنے کے بعد اس میں انتشار بھی پیدا کر دیا۔

لافانی ہونا غیر معمولی بات نہیں ہے۔ انسان کے سوا سبھی مخلوقات لافانی ہیں کیوں کہ وہ موت سے لاعلم ہیں۔ خوف ناک اور ناقابل فہم بات یہ ہے کہ انسان یہ جان لے کہ وہ غیر فانی ہے۔ میں نے غور کیا کہ مذاہب کی موجودگی کے باوجود انسانوں میں یہ عقیدہ بہت کم یاب ہے۔ یہودی، عیسائی اور مسلمان

ابدیت کے قائل ہیں۔ خاص طرح کی تقدس مآبی وہ اس دنیا سے منسوب کرتے ہیں تاکہ یہ ثابت ہو کہ انھیں اس پر ایقان ہے۔ حالاں کہ وہ دوسری دنیاؤں کو مقدر بنائے بیٹھے ہوتے ہیں جو غیر محدود تعداد میں ہیں اور اس دنیا کی جزا یا سزا کی صورت میں ظاہر ہوں گی۔

ہندوستانی مذاہب کا ''چکر'' کا تصور مجھے زیادہ معقول معلوم ہوتا ہے۔ اس چکر میں، جس کا نہ کوئی آغاز ہے نہ اختتام، ہر زندگی گزشتہ زندگی سے اثر پذیر ہوتی اور آئندہ زندگی کے ظہور کا سبب بنتی ہے۔ لیکن کوئی زندگی حتمی یا آخری نہیں ہوتی۔ صدیوں کی ریاضت اور ذہنی تربیت کے بعد لافانی انسانوں نے تحمل اور کسی حد تک بے اعتنائی کے رویے میں کمال حاصل کیا تھا۔ وہ جان گئے تھے کہ وقت کے ایک لامتناہی وقفے میں تمام انسانوں کے ساتھ تمام واقعات رونما ہوتے ہیں۔ اپنے ماضی یا مستقبل کی فضیلتوں کے سبب ہر انسان میں کامل خیر اور اپنے ماضی یا مستقبل کی روسیاہیوں کے سبب کامل گم راہی کا مادہ موجود ہوتا ہے جیسے جفت اعداد توازن کی جانب مائل ہوتے ہیں۔ بعینہ بذلہ سنجی اور بھونڈے پن کی اہلیتیں ایک دوسرے کی تقطیع اور تصحیح کرتی ہیں۔ ہر گزرتا ہوا احساس ایک غیر مرئی نظام کے تابع ہوتا ہے۔ میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جنھوں نے برائی کا ارتکاب کیا تاکہ آنے والی صدیوں میں یہ خیر پر منتج ہو یا ان واقعات پر اثر انداز ہو جو ماضی میں ہو چکے ہیں۔ اس طور دیکھا جائے تو ہمارے تمام افعال جائز ہیں لیکن وہ بے اثر بھی ہیں۔ کیوں کہ اخلاقی یا عقلی معیارات کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ہومر نے اوڈیسی کی تشکیل کی۔ اگر ہم وقت کے لامتناہی دور کا تصور کریں جس میں لامحدود واقعات اور تغیرات رونما ہوں تو پھر ممکن ہے اوڈیسی کو کم از کم ایک بار پھر تخلیق کیا جا سکے۔ کوئی انسان کچھ نہیں ہے لیکن ایک لافانی انسان سب انسانوں پر محیط ہے۔ کارنیلیس اگر یپا کی طرح میں دیوتا ہوں، میں سورما ہوں، میں فلسفی ہوں، میں ابدی ہوں اور میں دنیا ہوں۔ یہ سب کچھ اصل میں اس تکلیف دہ بات کو کہنے کے مترادف ہے کہ میں موجود نہیں ہوں۔

دنیا کے اس تصور نے کہ یہ اجمالی مکافات عمل کا ایک نظام ہے، لافانی انسانوں کو شدید متاثر کیا۔ پہلا ردعمل یہ ہوا کہ ان میں ترحم کی حس عنقا ہو گئی۔ میں ان قدیم گڑھوں کا ذکر کر چکا ہوں جن کی پرلی طرف موجود میدان شکن آلود ہو چکا تھا۔ ایک مرتبہ ایک شخص سب سے گہرے گڑھے میں سر کے بل گرا۔ وہ زخمی نہیں ہوا نہ مر سکا، بل کہ پیاس سے جلتا رہا، جب تک وہ اس کے لیے رسی نیچے پھینکتے، ستر برس بیت چکے تھے۔ ان کے لیے جسم ایک اطاعت شعار پالتو جانور تھا اور اس کے لیے وہ سب کچھ کافی تھا جو وہ ہر ماہ اسے نیند کے چند گھنٹوں کے بجتے، کچھ پانی اور گوشت کے ایک ٹکڑے کی صورت میں دیتے تھے۔ ہم کسی کو یہ موقع کیوں دیں کہ وہ ہمیں محدود کرے۔ خیال کی مسرت سے زیادہ پیچیدہ کوئی دوسری مسرت نہیں ہے۔ ہم نے

خود کو اسی کی سپردگی میں دے دیا۔ کبھی کوئی غیر معمولی مہیج ہمیں مادی دنیا کی جانب مائل کرتا ہے، مثال کے طور پر جیسا اس صبح بارش کے قدیم مظہراتی سرور نے کیا۔ لیکن ایسے مواقع شاذ ہی پیدا ہوتے ہیں۔

تمام لافانی انسان مطلق سکوت کی حالت میں رہنے کے اہل ہیں۔ مجھے ایک ایسا شخص یاد ہے جسے میں نے کبھی حالتِ قیام میں نہیں دیکھا۔ اس کی چھاتی پر پرندوں نے گھونسلے بنا لیے تھے۔

اس عقیدے، کہ کوئی ایسی شے موجود نہیں ہے جو کسی دوسری شے میں اپنی تلافی کی صورت نہیں رکھتی، کی فروعات میں سے ایک فرع نے نہایت کم نظریاتی وقعت کی حامل ہونے کے باوصف دسویں صدی کی شروعات یا اختتام کے قریب ہمیں خود کو پردہ زمین پر ہر سمت بکھر جانے کی ترغیب دی۔ اسے ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے ''ایک دریا ایسا ہے جس کے پانیوں میں حیات جاوداں کا رس بہتا ہے۔ سو خطہ ارض پر کہیں نہ کہیں ایک ایسا دریا بھی ہوگا جو اس اثر کو رفع کر دے۔'' دریاؤں کی تعداد غیر محدود نہیں ہے۔ ایک لافانی مسافر جو دنیا کا سفر کرے، آخر کسی روز ان سب دریاؤں کا پانی چکھ لے گا۔ ہم نے اس دریا کو دریافت کرنے کی ٹھان لی۔

موت (یا اس کی تلمیح) انسان کو رقت انگیز بناتی ہے۔ وہ صرف اپنی التباسی صورت حال کے باعث ہی متحرک رہتا ہے یعنی یہ کہ ہر فعل جو وہ کرتا ہے، ہو سکتا ہے اس کا آخری فعل ہو۔ کوئی ایسا چہرہ نہیں ہے جو خواب کے چہرے کی مانند منتشر ہو جانے کے امکان سے تہی ہو۔ فانی انسانوں کی ہر شے بازیافت ناپذیر اور مہلک ہے۔ جب کہ دوسری طرف لافانی انسانوں کا ہر فعل (اور ہر خیال) دیگر افعال یا خیالات کی گونج ہے جو کسی مرئی آغاز کے بغیر پیش رو کی حیثیت سے ماضی میں ہوئے۔ یا پھر ان افعال و خیالات کے مطلق پیش بین ہیں جو مستقبل میں زیادہ بین انداز میں رونما ہوں گے۔ کوئی شے ایسی نہیں ہے جو ان گنت آئینوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو جانے کی کیفیت میں مبتلا نہ ہو۔ کوئی واقعہ کبھی صرف ایک مرتبہ نہیں ہوتا۔ لافانی انسانوں کے لیے غم ناکی، سنجیدگی، ریت رواج جیسی کوئی شے اہم نہیں ہے۔ ہومر اور میں تانگیر کے پھاٹکوں پر جدا ہوئے۔ میرا خیال ہے ہم نے ایک دوسرے کو الوداع بھی نہیں کہا۔

(۰)

میں نے متعدد بادشاہتوں اور سلطنتوں کی سیاحت کی۔ ۱۰۶۶ء کے موسم خزاں میں میں سٹامپ فورڈ برج پر لڑا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں ہیرولڈ کی فوجوں کے ساتھ تھا جنھیں اپنی منزل کو پانے میں زیادہ عرصہ نہ لگا، یا پھر بد بخت ہیرالڈ ہارڈ ریڈا کی فوجوں میں شامل تھا جو انگریزی سرزمین کو محض چھ فٹ تک ہی فتح

کر پائیں، یا پھر اس کے علاوہ کوئی صورت تھی۔

ساتویں صدی ہجری میں بلق کے مضافات میں میں نے ایک مخصوص رسم الخط اور ایسی زبان میں، جسے میں بھول چکا ہوں اور ایسے حروف تہجی میں جن سے میں اب شناسا نہیں رہا، سند باد کی سات مہمات نقل کیں۔ سمرقند میں ایک جیل کے صحن میں، میں نے شطرنج کی ایک بڑی بازی کھیلی۔ بکنر اور بوہیمیا میں میں نے جوتش کا علم سیکھا۔

۱۶۳۸ء میں میں کولوزسوار 'Koloz svar' اور بعدازاں لپ زگ میں رہا۔ ۱۷۱۴ء میں ابرڈین میں پوپ کی ایلیڈ کی چھ جلدیں خریدیں۔ مجھے یاد ہے میں نے کیسے اشتیاق سے ان کے صفحات کو پلٹا تھا۔ ۱۷۲۹ء کے لگ بھگ میں نے فن خطابت کے ایک پروفیسر، جس کا نام غالباً گیام بیٹسا تھا، اس نظم کے ماخذ کے متعلق گفت گو کی۔ مجھے اس کے دلائل ناقابل تردید معلوم ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں اکتوبر کی چار تاریخ کو پٹنا کو، جو مجھے بمبئی لے جا رہا تھا، اریٹرین کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہونا پڑا۔ میں کنارے پر اتر کر آگے بڑھا۔ میں نے ان متعدد قدیم صبحوں کو یاد کیا جب میں رومی فوج کا ایک کپتان تھا اور سرخ دریا کے سامنے کھڑا تھا اور بخار اور جادو اور کاہلی نے میرے سپاہیوں کو ناکارہ بنا دیا تھا۔ شہر کے مضافات میں، میں نے صاف پانی کا ایک چشمہ دیکھا، میں نے عادتاً اس میں سے پانی پیا۔ کنارے پر آیا تو ایک خاردار جھاڑی نے میرے ہاتھ کی پشت کو چیر دیا۔ یہ غیر معمولی درد مجھے بہت اذیت ناک محسوس ہوا۔ بے اعتقادی کے ساتھ میں بولنے سے قاصر مگر سرور کی کیفیت میں غرق تھا۔ میں نے خون کے ست رو قطرے کی پیچیدہ ساخت پر غور کیا۔ ایک بار پھر میں دوسرے انسانوں کی مانند فانی تھا۔ اس رات میں صبح تک سویا رہا۔

ایک سال کے وقفہ کے بعد میں نے ان صفحات کو دوبارہ ملاحظہ کیا۔ میں پر یقین ہوں کہ ان میں سچ لکھا ہے۔ لیکن اولین ابواب میں اور دوسرے ابواب کے چند خاص پیروں میں مجھے کچھ غلط بیانی کا ادراک ہوا۔ یہ عیب شاید اتفاقی تفصیلات کے بے جا بیان کے سبب پیدا ہوا تھا۔ یہ طریقہ کار میں نے شاعروں سے سیکھا ہے جو ہر شے کو مبالغہ آمیزی سے کام لے کر آلودہ کر دیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ تفصیلات حقائق کا حصہ ہوں مگر ان حقائق کا ان کی یادداشت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ میں نے ایک کہیں زیادہ ٹھوس وجہ دریافت کر لی۔ میں اسے ضرور لکھوں گا۔ میری بلا سے چاہے مجھ پر تخیل پرست ہونے کا الزام دھرا جائے۔

میں نے جو کہانی بیان کی، وہ غیر حقیقی معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس میں دو مختلف انسانوں کے واقعات آپس میں گڈ مڈ کر دیے گئے ہیں۔ پہلے باب میں گھڑ سوار اس دریا کا نام معلوم کرنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے جو تھیبز کی فصیلوں کے ساتھ ساتھ بہتا ہے۔ فلامین سروفس، جو پہلے اس شہر کو ہیکا ٹام پائیلس

کا نام دے چکا تھا، کہتا ہے کہ یہ دریائے 'مصر' ہے۔ یہ تمام جملے اس کی بہ جائے ہومر کے اسلوب سے زیادہ مطابقت رکھتے ہیں جو تھیبز ہیکاٹا مپائیلس کی 'ایلیڈ' میں اپنا اظہار کرتا ہے اور جو اوڈیسی میں پروٹیئس اور یولیسز کی زبانی حتمی انداز میں کہتا ہے کہ 'مصر کا دریائے نیل'۔"

دوسرے باب میں رومی باشندے نے آبِ حیات پینے کے بعد یونانی زبان میں چند الفاظ کہے، یہ الفاظ بھی ہومر کی طرزِ نگارش کے آئینہ دار ہیں۔ انھیں جہازوں کی معروف فہرست کی آخری سطروں میں پڑھا جاسکتا ہے۔ بعد ازاں چکر دار محل کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ اس پر مجھے ندامت ہے۔ یہ الفاظ بھی ہومر کے ہیں جو دراصل اس دہشت کا خالق تھا۔ انھی بے ضابطگیوں نے مجھے متوحش کیا۔ ان میں سے کچھ جمالیاتی نوعیت کی تھیں جن کی مدد سے میں سچ تک پہنچ پایا۔ یہ سب آخری باب میں شامل ہیں۔ وہاں یہ لکھا ہوا ہے کہ میں 'سٹامفورڈ برج' پر لڑا۔ میں نے بلق میں سیاح سندباد کی سیاحتوں کو نقل کیا۔ میں نے ابرڈین میں پوپ کی انگریزی زبان میں لکھی گئی 'ایلیڈ' کو خریدا۔ وہاں یہ بھی پڑھا جاسکتا ہے کہ میں نے بکنز اور پھر بوہیمیا میں جوتش کا علم سیکھا۔ ان میں سے کوئی ایک شہادت بھی غلط نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ انھیں اصرار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان میں سے ابتدائی چند شہادتیں ایک جنگ جو کے لیے مناسب معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن قاری کو احساس ہوگا کہ راوی جنگ جویانہ سرگرمیوں پر زیادہ گفت گو سے احتراز کرتا اور انسانی قسمت سے متعلق مباحث پر زورِ بیان صرف کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ میں نے یہ سب کچھ ایک خاص وجہ سے لکھا ہے۔ میں نے یہ اس واسطے لکھا کیوں کہ مجھے احساس تھا کہ یہ روداد حسرت انگیز ہے۔ رومی فلامینس روفس کی زبانی یہ ایسا نہیں لگتا۔ دراصل اسے ہومر نے بیان کیا۔ تعجب خیز بات یہ ہے کہ موخر الذکر نے تیرھویں صدی میں سندباد یعنی ایک دوسرے یولیسز کی مہمات کو نقل کیا اور متعدد صدیوں بعد ایک وحشیانہ زبان میں اپنی ایلیڈ کی نئی ہیئتوں کو بیان کیا۔ جہاں تک اس فقرے کا تعلق ہے، جس میں 'بکنز' کا لفظ استعمال ہوا، تو یہ بات واضح ہے کہ یہ ایک باعلم شخص کا اختراع کردہ ہے جو (جہازوں کی فہرست کے مصنف کی مانند) رفیع الشان الفاظ لکھنے کا متمنی تھا۔

اختتام قریب ہو تو یادداشت میں موجود شبیہیں باقی نہیں رہتیں۔ صرف لفظ رہ جاتے ہیں۔ یہ بات تعجب خیز نہیں ہے کہ وقت نے الفاظ کو الجھا دیا جنھوں نے کبھی مجھے اس شخص کی قسمت کی علامتوں سے باندھے رکھا جو کتنی ہی صدیاں میرے ساتھ رہا۔ میں ہومر رہ چکا ہوں۔ جلد ہی میں یولیسز کی طرح کچھ بھی نہیں رہوں گا۔ جلد ہی میں تمام انسانوں پر محیط ہو جاؤں گا۔ میں مر جاؤں گا۔

مزید عبارت (۱۹۵۰ء): گزشتہ اشاعت سے متعلق منظرِ عام پر آنے والے تبصروں میں سے ایک

اہم تبصرے کا نام، جسے انتہائی شائستہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا، "بائبل کی مطابقت سے کئی رنگوں کا ایک لبادہ" (مانچسٹر، ۱۹۴۸ء) ہے۔ یہ ڈاکٹر ناہم کارڈویرو کے انتہائی سرکش قلم کا شاخسانہ ہے۔ یہ قریب سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں مصنف نے یونانی سینٹوز کا ذکر کیا ہے۔ قدیم لاطینی زبان کے سینٹوز کا، الیگزینڈر راس کی "Virgiliuo evangelizans" کا، جارج موز کی تراکیب کا، اور ایلیٹ کا، اور آخر میں اس اسلوب نگارش کا ذکر کیا گیا ہے جسے قدیم نوادرات کے بیوپاری جوزف کارٹافیلس سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اول باب میں وہ پلینی کی Historia naturalis, V,8، دوسرے باب میں تھامس ڈی کوئینسی کی Writings, III, 439، تیسرے میں سفیر پیرے چانٹ کے نام ڈیکارت کے مکتوبات اور چوتھے میں برناڈ شا کی Back to Methuselab V سے مختصر الحاقی عبارتوں کا انتخاب کر کے وہ ان پر شدید جرح کرتا ہے۔ ان بے جا اضافوں یا سرقہ بازیوں کی نشان دہی کے بعد وہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ پوری دستاویز ہی مشکوک ہے۔

میری رائے میں اس نوع کا نتیجہ نا قابل قبول ہے۔ "جب اختتام قریب ہو" کارٹافیلس نے لکھا ہے "تو یادداشت میں موجود کوئی شبیہ باقی نہیں رہتی۔ صرف الفاظ رہ جاتے ہیں"۔ الفاظ، اپنی جگہ سے سرکے ہوئے اور حذف کیے ہوئے، دوسروں سے منسوب الفاظ۔ یہ وہ مختصر باقیات تھیں، جو زمانوں اور صدیوں کے بعد اس کے پاس رہ گئی تھیں۔

'تیس' کا مسلک

اصل مسودہ لیڈن یونی ورسٹی میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ لاطینی زبان میں ہے۔ تاہم اس میں یونانی کلاسیکی ادب کے چند اوصاف کی موجودگی کی بنا پر یہ مفروضہ قائم کیا جا سکتا ہے کہ اسے یونانی زبان سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ 'لیس گانگ' کے مطابق اسے چوتھی صدی عیسوی میں لکھا گیا تھا۔ اپنی کتاب 'انحطاط و زوال' کے پندرھویں باب کے ایک حاشیے میں گبن نے اس کا سرسری طور پر ذکر کیا ہے۔ مسودے کا گم نام مصنف لکھتا ہے:

"...یہ مسلک کبھی زیادہ نہ پھیلا۔ اس کے معتقدین تعداد میں نہایت کم ہیں۔ آگ میں جلا کر یا تلوار کے وار سے ان کی بڑی تعداد کو قتل کر دیا گیا۔ یہ کسی بھی اوٹ میں سو جاتے ہیں۔ انھیں اپنے لیے کسی قسم کی قیام گاہ بنانے کی ممانعت ہے۔ یہ جنگوں سے تباہ حال کھنڈرات میں رہتے ہیں۔ بالکل برہنہ حالت

میں سفر کرتے ہیں۔ یہ تو وہ باتیں ہیں جنھیں سبھی جانتے ہیں۔ میرا مقصد ان تمام حقائق کو یہاں تحریری طور پر محفوظ کر دینا ہے جو اس مسلک کے عقائد اور رسوم و رواج سے متعلق مجھ پر آشکار ہوئے۔ میں نے اس مسلک کے مذہبی رہنماؤں سے مناظرے کیے۔ لیکن انھیں اپنے مذہب کی طرف مائل کرنے میں مجھے بہت کم کام یابی ہوئی۔

اس مسلک سے متعلق پہلی اہم شے جس میں مجھے دل چسپی محسوس ہوئی، مُردوں کے بارے میں ان کے عقائد کا تنوع ہے۔ مثال کے طور پر اس مسلک کے ماننے والے عام افراد کا عقیدہ ہے کہ مرنے والوں کی تکفین کا مطلب انھیں ان کی روحوں کو سونپنا ہوتا ہے۔ جو بے عقیدہ لوگ ہیں ان کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰ مسیح کی اس فہمائش 'مُردوں کو اپنے مردے دفنانے دو' کا مطلب یہ ہے کہ وہ تجہیز و تکفین سے متعلق ہماری شاہانہ رسومات سے نالاں تھے۔

اس مسلک کا ہر پیروکار اس ہدایت پر مکمل عمل کرتا ہے کہ 'جو کچھ کسی کے پاس ہے، اسے بیچ دو اور غربا میں خیرات کر دو۔' جو صاحب استطاعت ہیں وہ خود سے کم تر کو خیرات دیتے ہیں اور جو کم تر ہیں، وہ آگے کسی کم ترین کو۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو ان کے افلاس اور برہنگی کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ یہ کیفیت انھیں فردوس عدن کے آدم سے قریب تر کرتی ہے۔

جوش و خروش کے ساتھ وہ ان الفاظ کو دہراتے ہیں، ''ہوا میں اڑتے ہوئے پہاڑی کوّوں کا مشاہدہ کرو۔ نہ یہ زمین میں تخم ریزی کرتے ہیں۔ نہ یہ پودوں کی صورت نمو پاتے ہیں۔ نہ یہ سائبان بناتے ہیں اور نہ گھونسلا۔ پھر بھی تمھارا آسمانی باپ ان کو خوراک دیتا ہے۔ کیا تم ان سے بہتر نہیں ہو؟'' یہ اپنے عقیدے کے باعث ہر طرح کی پس اندازی سے محترز رہتے ہیں۔ ''اگر خدا زمین کو گھاس کا لباس عطا کرتا ہے جو آج ہے، مگر کل اسے بھٹی میں جھونک دیا جائے گا، تو کیا وہ تمھیں لباس نہ دے گا۔ اے بے عقیدہ لوگو کبھی فکر مت کرو کہ ہم کیا کھائیں گے؟ یا ہم کیا نوش کریں گے؟''

اس مسلک کا ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ ''جس شخص نے عورت کو بری نظر سے دیکھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے چھونے سے پہلے ہی دل میں اس کے ساتھ زنا کر چکا ہے۔'' دراصل یہ انسانی عصمت کی حفاظت کی خاطر براہ راست ہدایت ہے۔ تاہم اس مسلک کے ایسے پیروکاروں کی تعداد کم نہیں ہے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ اس دنیا میں اگر کوئی ایک شخص بھی ایسا موجود ہے جس نے عورت کو نظر بد سے دیکھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف وہی نہیں بل کہ تمام انسانیت زنا کاری کی مرتکب ہوئی۔ بدی کی خواہش، بدی کے ارتکاب جیسا ہی سنگین گناہ ہے۔ خواہش کے ذریعے ایک انسان کچھ بھی کیے بغیر ایک سنگین بدکاری کا

ارتکاب کر سکتا ہے۔

یہ مسلک عبادت گاہوں پر یقین نہیں رکھتا۔ اس مسلک کے مبلغین کسی پہاڑ یا دیوار یا بعض اوقات ساحل پر کھڑی کشتی پر چڑھ کر تبلیغ کرتے ہیں۔

اس مسلک کے نام سے متعلق مسلسل قیاس آرائیاں کی جاتی ہیں۔ ایسے ہی ایک قیاس کے مطابق اس کا نام اس کے پیروکاروں کی اس تعداد کا غماز ہے جو باقی رہ گئی ہے۔ یہ بات مضحک معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس میں ایک طرح کی پیشین گوئی کا عنصر موجود ہے۔ اس کے عقائد اس درجہ کج رو ہیں کہ آخر ایک دن یہ مسلک معدوم ہو کر ہی رہنا تھا۔ یوں بھی قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ نام کشتی نوح کی اونچائی سے ماخوذ ہے جو تیس ' کیوبٹ' تھی۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ایک قمری مہینے میں شامل راتوں کی تعداد پر مبنی ہے۔ تاہم یہ مفروضہ تقویم کی موجودہ ہیئت سے غیر موافق ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بپتسمہ کے وقت حضرت عیسیٰ مسیح کی عمر تیس برس تھی۔ کچھ کہتے ہیں کہ یہ حضرت آدم کے ان برسوں کی تعداد پر مبنی ہے جن کے بعد وہ زمین کی سرخ مٹی سے اٹھائے گئے تھے۔ یہ تمام قیاسات مساوی طور پر غیر درست ہیں اور اتنی ہی غیر معتبر ان تیس دیوتاؤں کے سروں یا مسندوں کی فہرست ہے۔ ایک دیوتا کا نام ابراکس ہے۔ اس دیوتا کا سر مرغے کا ہے، بازو اور دھڑ انسانی اور پیچھے ایک لپٹے ہوئے سانپ جیسی دم ہے۔

'سچ' کو بیان کرنے کی بے پایاں اہلیت مجھے نہیں ملی۔ یعنی میں ایسا شخص ہوں جو سچ سے واقف تو ہے مگر اسے بیان کرنے کے اہل نہیں ہے۔ میں خود کو قابل نفرت بدعت کے بیان تک ہی محدود رکھوں گا۔ 'لفظ' کو گوشت پوست کا جسم دیا گیا ہے تاکہ یہ دوسرے انسانوں کی مانند ہی ایک انسان کا روپ دھار لے اور سولی پر چڑھ کر خدا کی تصدیق کرے اور پھر اسی خدا کے ذریعے نجات پائے۔ اس کی پیدائش منتخب عورت کے بطن سے ہوتی ہے۔ صرف محبت کے پرچار کے لیے نہیں بل کہ شہادت کی فضیلت کے حصول کے لیے بھی۔

یہ ضروری ہے کہ واقعات اپنی ہیئت میں ناقابل فراموش ہوں۔ ایک انسان کا تلوار کے وار یا زہر سے بھرا پیالہ پینے سے مر جانا، نوع انسان کے ذہن کو وقت کے اختتام کی طرف متوجہ کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ خدائے بزرگ و برتر نے اشیا کو ڈرامائی انداز میں ترتیب دیا ہے۔ یہ اشیا ایک طور سے توجیہ پیش کرتی ہیں عشائے ربانی کی، یسوع مسیح کے الفاظ کی جن میں اس کے افشائے راز کی پیشین گوئی کی گئی تھی، اپنے حواریوں میں سے ایک کو یسوع کی مسلسل تنبیہ کی، نان اور شراب کی لذت کی، پیٹر کے وعدوں کی، بارہ حواریوں کی خوابیدگی کی، خدا کے بیٹے کی انسانی دعا کی، پسینے جیسے خون کی، تلواروں اور ڈنڈوں

کے جمِ غفیر کی، بے وفائی کے بوسے کی، یسوع کے ہاتھ دھونے کے عمل کی، تازیانہ زنی کی، طعن وتشنیع کی، کانٹوں کے تاج کی، ارغوانی قبا اور سرکنڈوں کے عصا کی، کڑوے سرکے کی، پہاڑ کی چوٹی پر ایستادہ صلیب کی، نادم چور سے کیے گئے وعدے کی، کپکپاتی زمین اور زمین پر پھیلی تاریکی کی۔

الہامی معاونت کی وجہ سے میں اس قابل ہو پایا ہوں کہ اس مسلک کے نام کی اصل اور مخفی وجہ معلوم کر پاؤں۔ کیری اوتھ میں، جہاں اس مسلک کا موجودہ صورت میں ظہور ہوا، ایک مجلس منحرفین موجود ہے جو 'تمیں سکے' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ اس کا ابتدائی نام ہے۔ اس سے ہمیں کچھ سراغ ملتا ہے اصل معاملے کا۔ یسوع کو سولی پر چڑھانے کے ناٹک میں (میں یہ بات تمام تر تقدس اور احترام کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کہہ رہا ہوں) کچھ اداکار دانستہ اور کچھ نادانستہ طور پر اس میں شامل تھے، مگر سبھی ضروری اور ناگزیر۔ نادانستہ طور پر شامل اداکار پادری تھے جنھوں نے چاندی کے سکے عطا کیے۔ نادانستہ اداکار وہ ہجوم تھا جس نے 'باراباس' کے متعلق استفسار کیا۔ نادانستہ اداکار یہودا کا حاکم تھا۔ نادانستہ اداکاروں میں رومی سپاہی بھی شامل تھے جنھوں نے یسوع مسیح کو سولی پر چڑھانے کے لیے صلیب نصب کی۔ جنھوں نے میخیں ٹھونکیں اور یسوع مسیح کا لباس حاصل کرنے کے لیے قرعہ اندازی کی۔ دانستہ اداکار بس دو ہی تھے۔ نجات دہندہ اور یسوع مسیح۔ موخرالذکر نے چاندی کے تیس سکے مرحمت کیے جو نجات کی قیمت تھے اور خود کو سولی پر ٹنگوالیا۔ بہ طور انسان تب ان کی عمر تینتیس برس تھی۔ مسلک میں سبھی اداکار لائق پرستش ہیں۔ تاہم باقی سب کو معاف کر دیا جاتا ہے۔ کیوں کہ مجرم کوئی ایک شخص نہیں ہے۔ ہر شخص، ارادی یا غیر ارادی طور پر الہامی عقل کے وضع کردہ اس منصوبے کا ایک حصہ ہے۔ سو اس عظمت میں سبھی حصہ دار ہیں۔

مزید کوئی کراہت انگیز بات لکھتے ہوئے میرے ہاتھ کپکپاتے ہیں۔ اپنے بزرگوں کے تتبع میں اس مسلک کے پیروکار مقررہ عمر کو پہنچنے کے بعد خود کو تضحیک کا نشانہ بناتے ہیں اور پہاڑ کی چوٹی پر سولی پر چڑھ جاتے ہیں۔ پانچویں امر ربی کی قابل تعزیر خلاف ورزی کو تمام تر شدت کے ساتھ، جو انسانی اور الہامی ضابطہ قانون کا منتہا و مقصود ہے، اپنے انجام کو پہنچنا چاہیے۔ تمام انسانی عذاب، ملائکہ کی نفرت...''

یہاں مسودہ تمام ہوتا ہے۔ مزید مسودہ دریافت نہیں ہو سکا۔

قُرص

میں ایک لکڑہارا ہوں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میرا نام کیا ہے۔ وہ جھونپڑی جہاں میں پیدا ہوا اور جہاں غالباً میں جلد ہی مر جاؤں گا، جنگل کے کنارے ایستادہ ہے۔

اس جنگل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایسے سمندر تک پھیلا ہوا ہے جو تمام زمین پر محیط ہے اور یہ کہ اس جنگل میں ایسے جھونپڑے جیسا کہ ایک میرا بھی ہے، دور تک بکھرے ہوئے ہیں۔ میں نے سمندر کبھی نہیں دیکھا۔ اس لیے میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ نہ ہی میں کبھی جنگل کا پرلا کنارہ دیکھ پایا ہوں۔ بچپن میں میرے بڑے بھائی نے مجھ سے قسم لی تھی کہ ہم سارے جنگل کو کاٹ ڈالیں گے حتیٰ کہ ایک درخت بھی باقی نہیں بچے گا۔ میرا بھائی مر گیا۔ جو کچھ میں اب تلاش کر رہا ہوں یا آئندہ تلاش کروں گا' اس کا میرے بھائی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ ایک بہت مختلف شے ہے۔ مغرب کی سمت ایک ندی بہتی ہے جس میں سے میں اپنے ہاتھوں سے مچھلی شکار کرتا ہوں۔ جنگل میں بھیڑیے ہیں۔ لیکن میں بھیڑیوں سے خوف زدہ نہیں ہوں۔ اپنے کلہاڑے پر مجھے اعتماد ہے اور اس کے پھل نے کسی موقع پر مجھے ناکامی کا منہ نہیں دیکھنے دیا۔

میں نے کبھی اپنی عمر کے برسوں کا شمار نہیں کیا۔ میں جانتا ہوں یہ تعداد میں کافی زیادہ ہیں۔ مجھے اب دکھائی نہیں دیتا۔ گاؤں میں' جہاں اب میں نہیں جاتا مبادا اپنا راستہ کھو بیٹھوں' مجھے سب 'بخیل' سمجھتے ہیں لیکن مجھ جیسے لکڑہارے کے پاس بھلا کیا خزانہ ہو سکتا ہے جسے میں ان سے چھپاؤں گا۔

برف پڑتی ہے تو اسے اندر آنے سے روکنے کے لیے میں اپنے گھر کے دروازے کے آگے ایک پتھر رکھ کر اسے کس کر بھیڑ لیتا ہوں۔ مدت پہلے ایک شام مجھے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر میرے گھر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ ایک اجنبی اندر داخل ہوا۔ وہ عمر رسیدہ اور دراز قد تھا اور ایک کٹے پھٹے کمبل میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک داغ تھا۔ اس کی پیرانہ سالی نے اس میں کوئی ضعف پیدا کرنے کی بہ جائے جیسے اسے استحکام اور وقار بخشا تھا۔ تاہم میں نے دیکھا کہ وہ ایک سونٹے کی مدد کے بغیر قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ ہم نے چند الفاظ کا تبادلہ کیا جو مجھے اب یاد نہیں ہیں۔ اس نے بتایا "میں بے گھر ہوں۔ جہاں جگہ ملتی ہے سو جاتا ہوں۔ میں نے سیکسونز کی سرزمین کے طول و عرض میں سفر کیا ہے۔"

ان الفاظ نے اس کی کہن سالی کی تصدیق کی۔ میرا باپ اکثر سیکسون کی سرزمین کا ذکر کرتا تھا جسے اب لوگ انگلستان پکارتے ہیں۔ میرے پاس روٹی اور مچھلی تھی۔ ہم نے کھانے کے دوران ایک لفظ بھی ایک دوسرے سے نہ کہا۔

میں نے فرش پر چند کھالیں بچھا کر، جہاں میرا بھائی مرا تھا، اس کے لیے گدا بنا دیا۔ رات ہوئی تو ہم سو گئے۔

دن کا اجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا جب ہم جھونپڑے سے روانہ ہوئے۔ بارش تھم گئی تھی اور زمین تازہ برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ میرے رفیق کا سونٹا اس کے ہاتھ سے پھسل گیا تو اس نے مجھے سونٹا اٹھانے کا حکم دیا۔

''میں تمھارا حکم کیوں مانوں۔'' میں نے کہا۔

''کیوں کہ میں ایک بادشاہ ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے سوچا کہ وہ پاگل تھا۔ سونٹا اٹھا کر میں نے اسے تھمایا۔ اس نے قدرے بدلی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں سیکجنز کا بادشاہ ہوں۔ اکثر بہت کٹھن لڑائیوں میں میں نے اپنے لوگوں کو فتح سے ہم کنار کیا۔ لیکن ایک نجس لمحے میں مجھ سے میری بادشاہت چھن گئی۔ میرا نام آئیسرن ہے اور میں اوڈن کی نسل میں سے ہوں۔''

''میں اوڈن کی پوجا نہیں کرتا۔ میں عیسیٰ مسیح کا عبادت گزار ہوں۔'' میں نے کہا۔

وہ چلتا رہا گویا میں نے سنا ہی نہ ہو۔ ''میں نے جلاوطنی کی زندگی گزاری ہے۔ لیکن میں اب بھی ایک بادشاہ ہوں کیوں کہ میرے پاس ایک قرص ہے۔ کیا تم اسے دیکھنا چاہو گے۔''

اس نے اپنے ہڈیالے ہاتھ کی مٹھی کھولی۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ تب مجھے یاد آیا کہ وہ ہمیشہ اپنا ہاتھ بند رکھتا تھا۔

مجھے بہ غور دیکھتے ہوئے وہ بولا ''تم اسے چھو کر دیکھ سکتے ہو۔''

کچھ شک کے ساتھ میں نے انگلی کی پوروں سے اس کی ہتھیلی کو چھوا۔ مجھے وہاں کچھ سرد شے محسوس ہوئی اور چمک سی دکھائی دی۔ مٹھی فوراً ہی بند ہو گئی۔ میں کچھ نہیں بولا۔ وہ آدمی بڑے تحمل سے بولتا رہا جیسے کسی بچے سے مخاطب ہو۔

''یہ اوڈن کی قرص ہے''۔ اس نے کہا ''اس کا بس ایک ہی رخ ہے۔ دنیا میں کوئی شے ایسی نہیں ہے جس کا بس ایک رخ ہو۔ جب تک قرص میری تحویل میں ہے' میں بادشاہ ہوں۔''

''کیا یہ سونے کی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتا۔ یہ اوڈن کی قرص ہے اور اس کا بس ایک ہی رخ ہے۔''

اسی لمحہ مجھ میں اس قرص کو حاصل کرنے کی لالچ نے جنم لیا۔ اگر یہ میرے پاس آجائے تو میں اسے سونے کے ڈلے کے عوض بیچ دوں گا۔ میں بادشاہ بن جاؤں گا۔ میں نے خانہ بہ دوش سے کہا کہ ''میں نے اپنے جھونپڑے میں سکوں سے بھرا ہوا ایک صندوق دبایا ہوا ہے۔ وہ سونے کے سکے ہیں اور کلھاڑی کے پھل

کی طرح چمکتے ہیں۔ اگر وہ مجھا وڈن کی قرص دے دے تو میں اسے بدلے میں وہ صندوق دے دوں گا۔"
اس نے تلخی سے جواب دیا "مجھے یہ سودا قبول نہیں ہے۔"
اس نے میری طرف اپنی پیٹھ موڑ لی۔ اس کی گردن کی پشت پر کلھاڑی کا ایک وار اسے پچھاڑ دینے کے لیے کافی تھا۔ جونہی وہ گرا اس کی مٹھی کھل گئی۔ ہوا میں مجھے چمک سی لہراتی دکھائی دی۔ میں نے اس جگہ کو اپنی کلھاڑی سے نشان زد کیا۔ اس کی لاش گھسیٹ کر ندی تک لایا جو بہت تیز بہ رہی تھی۔ لاش کو ندی میں پھینک دیا۔ جھونپڑے میں واپس آ کر میں نے قرص کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ مجھے کہیں نہ ملی۔ اس بات کو برسوں بیت چکے ہیں اور میں ابھی تک اس قرص کو تلاش کرنے کی کوشش کیے جا رہا ہوں۔

غدار اور سورما

"ہر افلاطونی برس
غلط اور درست کے نئے معیارات اگلتا ہے
اور اس کے بدلے پرانے معیارات نگل لیتا ہے
تمام انسان رقاص ہیں اور ان کے قدم
ایک گھڑیال کی وحشیانہ ٹھن ٹھن پر تھرکتے ہیں"
(ڈبلیو۔ بی۔ ییٹس۔ "مینارا")

چیسٹرٹن، جس نے عالی شان سرّی داستانیں ایجاد کیں اور پھر انھیں سجایا سنوارا، اور محلاتی مشیر لائبنیز، جو لمحہ تخلیق سے ماقبل موجود توازن کا دریافت کنندہ تھا، کے گہرے اثر تلے اپنی بے کار سہ پہروں میں، میں نے اس کہانی کے پلاٹ کا تصور کیا جسے میں شاید کسی روز لکھوں گا۔ مجھے لگتا ہے کہ اس میں تفصیلات، توازن اور ترتیب کا فقدان ہے۔ اس کہانی کی چند پرتیں ایسی ہیں جو ہنوز مجھ پر نہیں کھلیں۔ آج تین جنوری ۱۹۴۴ء کو مجھے یہ اس طور سمجھ میں آئی ہے:
یہ واقعہ ایک جبر زدہ اور سرکش ملک میں رونما ہوا۔ جیسے پولینڈ، آئرلینڈ، وینیٹین جمہوریہ، جنوبی امریکا یا بالکن ریاست... بل کہ یہ واقعہ ہو چکا ہے۔ راوی میرا ہم عصر ہی ہے۔ تاہم یہ کہانی انیسویں صدی کے آغاز یا وسط میں کہیں وقوع پذیر ہوئی۔ فرض کر لیتے ہیں (راوی کی سہولت کی خاطر) یہ ملک آئرلینڈ ہے۔ فرض کر لیتے ہیں کہ یہ سن ۱۸۲۴ء ہے۔ راوی کا نام "زیان" ہے۔ یہ نوجوان، ولید اور دل نشیں مقتول

فرگس کلپیٹرک کا پڑپوتا ہے جس کی قبر کی پراسرار طور پر بے حرمتی کی گئی، جس کی شخصیت میں ہیوگو اور براؤننگ کی شاعری کا رنگ موجود ہے اور جس کا مجسمہ سرخ دلدلوں کے وسط میں ایک بھورے رنگ کے پہاڑ کی زینت بنا ہے۔

کلپیٹرک ایک باغی تھا، باغیوں کے گروہ کا ایک خفیہ اور باوقار کپتان۔ حضرت موسیٰ نے موب کی سرزمین پر پیشین گوئی کی لیکن وہ موعودہ زمین تک نہیں پہنچ سکے۔ کلپیٹرک بھی فتح مند بغاوت کے واقعہ سے پیش تر ہی، جس کی اس نے پیش بندی کی اور اس کے بارے میں خواب دیکھا تھا، مارا گیا۔ اس کی موت کی اولین صد سالہ برسی قریب ہے۔ جرم کے واقعات پراسرار ہیں۔ اس سورما کی سوانح حیات لکھنے پر مامور ریان دریافت کرتا ہے کہ یہ معمہ پولیس کی سادہ تفتیش کی حدود سے پرے تک پھیلا ہوا ہے۔ کلپیٹرک کا قتل ایک ناٹک گھر میں ہوا۔ برطانوی پولیس کبھی قاتل کا سراغ نہیں لگا سکی۔ مورخین کا خیال ہے کہ یہ بات پولیس والوں کی نیک نامی کا دفاع نہیں کر پاتی ہے کیونکہ اغلب قیاس یہ ہے کہ پولیس ہی نے اسے قتل ہو جانے دیا تھا۔

اس معمے کی دیگر تفصیلات نے ریان کو الجھایا۔ یہ دائروی نوعیت کی ہیں۔ وہ دور افتادہ خطوں، دور افتادہ ادوار کے واقعات کو باہم ملاتی یا دہراتی معلوم ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر کوئی اس بات سے بے خبر نہیں ہے کہ سورما کی لاش کا معائنہ کرتے ہوئے افسران کو ایک سربمہر خط ملا تھا جس میں سورما کو ناٹک گھر جانے میں مضمر خدشے سے قبل از وقت آگاہ کیا گیا تھا۔ بالکل جیسے جولیس سیزر کو، اس مقام کی طرف جاتے ہوئے، جہاں اس کے دوستوں کے خنجر اس کے منتظر تھے، ایک رقعہ وصول ہوا جسے اس نے کبھی نہیں پڑھا اور جس میں غداروں کے ناموں کے ساتھ ساتھ غداری کا راز بھی فاش کیا گیا تھا۔ سیزر کی بیوی، کالپرینا نے ایک خواب میں ایک مینار کی تباہی کا منظر دیکھا جس کو منہدم کرنے کا فرمان مجلس اکابر نے جاری کیا تھا۔ کلپیٹرک کی موت سے قبل ملک بھر میں غلط اور گم نام افواہیں گردش کرنے لگی تھیں کہ کلگارون کا دائروی مینار جل کر بھسم ہو گیا ہے۔ اس بات کو ایک پیش آگاہی سمجھا جا سکتا ہے کیوں کہ کلپیٹرک کلگارون میں پیدا ہوا تھا۔ سیزر کے قصے اور ایک آئرش باغی کی کہانی کے درمیان ان متوازی باتوں (اور دیگر امور) نے ریان کو یہ قیاس کرنے پر مائل کیا کہ وقت کی ایک خفیہ ہیئت، دہرائے جانے والے عوامل کے ایک ڈھانچے کا وجود ہے۔ اس نے ایک عشری تاریخ کے بارے میں سوچا جس کا کونڈورسٹ نے تصور کیا تھا۔ ان صوریات کے متعلق سوچا جنھیں ہیگل، سپنگلر اور وائیسو نے تجویز کیا۔ ہیسوئڈ کے کرداروں کے بارے میں سوچا جو سونے سے لوہے میں ڈھل گئے۔ اس نے ارواح کے تناسخ کے عقیدے کے متعلق

سوچا، ایک تصور جس نے کلٹی زبان کے ادب کو دہشت سے مملو کیا۔ اس نے سوچا کہ فرگس کلپیٹرک ہونے سے پیشتر فرگس کلپیٹرک دراصل جولیس سیزر تھا۔ اس نے چند نئے حقائق دریافت کیے جنھوں نے اسے ان دائروی بھول بھلیوں سے نجات دی۔ ایسے حقائق جنھوں نے اسے ایک دوسری زیادہ لاینحل اور غیر متجانس بھول بھلیوں میں غرق کر دیا۔ یہ وہ خاص الفاظ تھے جنھیں ایک گداگر نے فرگس کلپیٹرک سے اس کی موت کے روز کہے، جسے شیکسپیئر اپنے المیہ ناٹک ''میکبتھ'' میں پہلے سے بہ طور نمونہ لکھ چکا تھا۔ یہ بات کہ تاریخ تاریخ ہی کی نقل ہوتی ہے، اپنے طور پر تو حیران کن ہے۔ لیکن تاریخ کا ادب کی تتبع کرنا بالکل ہی ناقابل فہم ہے۔

ریان نے معلوم کیا کہ ۱۸۱۴ء میں کلپیٹرک کے رفقا میں سے عمر رسیدہ ترین شخص الیگزینڈر نولان نے شیکسپیئر کے اہم ناٹکوں کا گالیک زبان میں ترجمہ کیا۔ ان میں سے ایک 'جولیس سیزر' بھی تھا۔ اسے محافظ خانہ میں سویڈش زبان کے ''Festspiele'' پر نولان کے مضمون کا مسودہ بھی ملا یعنی ناٹک کے بے پایاں اور گم راہ کن سوانگ کی تکنیک پر، جس کے لیے ہزارہا اداکاروں کی ضرورت ہوتی اور جس کے تحت تاریخی واقعات کو انھی شہروں اور پہاڑوں پر دہرایا جاتا جہاں وہ حقیقتاً رونما ہوئے ہوتے۔ ایک دوسری غیر مطبوعہ دستاویز سے اس پر منکشف ہوا کہ موت سے چند روز قبل کلپیٹرک نے آخری اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے ایک غدار کی موت کے پروانے پر دستخط کیے تھے جس کا نام کھاتوں میں سے حذف کر دیا گیا۔ یہ فرمان کلپیٹرک کی رحم دلانہ فطرت سے میل نہیں کھاتا۔ ریان اس معاملے کی تفتیش کرتا ہے۔ (یہ تفتیش میرے پلاٹ کے کھوکھلے حصوں میں سے ایک ہے) وہ اس معمے کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

کلپیٹرک کو ایک تھیٹر میں قتل کیا گیا۔ لیکن تمام شہر خود بھی تو ایک تھیٹر تھا۔ اداکار ایک فوجی دستے پر مشتمل تھے۔ وہ ناٹک جس میں اس کی موت کا واقعہ ہوا بعد ازاں کئی دن اور کئی راتیں جاری رہا۔ واقعہ یوں ہوا تھا۔

۱۸۴۲ء میں اگست کی دو تاریخ کو باغی اکٹھے ہوئے۔ ملک میں بغاوت کے لیے حالات مکمل طور پر سازگار تھے۔ لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی اہم اقدام ناکام ثابت ہوتا۔ گروہ میں کوئی غدار موجود تھا۔ فرگس کلپیٹرک نے غدار کا سراغ لگانے کی ذمہ داری جیمز نولان کو سونپی۔ نولان نے اپنی ذمہ داری نبھائی۔ اس نے اجلاس کے دوران اعلان کیا کہ غدار خود کلپیٹرک تھا۔ اس نے اپنے الزام کی صداقت کو ناقابل تردید شواہد سے ثابت کیا۔ باغیوں نے اپنے صدر کے لیے موت کی سزا تجویز کی۔ اس نے خود اپنی موت کے پروانے پر دستخط کیے لیکن یہ درخواست کی کہ اس سزا سے اس کے ملک کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

جبھی نولان کو یہ عجیب منصوبہ سوجھا۔ آئرلینڈ کلپیٹرک کو پوجتا تھا۔ اس کی غداری کی معمولی سی افواہ بغاوت کے مقصد کو غارت کر سکتی تھی۔ نولان نے ایک منصوبہ بنایا جس سے غدار کی موت ملک کی آزادی کے حق میں ایک ہتھیار بن سکتی تھی۔ اس نے تجویز کیا کہ مجرم کا قتل ایک غیر معلوم قاتل کے ہاتھوں خاص طور پر پیدا کردہ ڈرامائی صورت حال میں ہونا چاہیے جو عوام کے تخیل میں ثبت ہو جائے گی اور بغاوت کے عمل کو تیز کر دے گی۔ کلپیٹرک نے عہد کیا کہ وہ اس منصوبے میں ان کا ساتھ دے گا۔ اس طور اسے کفارے کا ایک موقع میسر آئے گا۔ مزید براں اس تحریک کے لیے اس کی موت ایک اہم کامیابی ثابت ہو گی۔

وقت کی نزاکت کے پیش نظر نولان اپنے طور پر کثیر المقاصد قتل کے لیے تمام حالات پیدا کرنے کے اہل نہیں تھا۔ اسے ایک دشمن انگریز ڈراما نگار ولیم شیکسپیئر سے پلاٹ سرقہ کرنا پڑا۔ اس نے میکبتھ سے، جولیس سیزر سے منظر چرائے۔ اس عوامی اور خفیہ سازش کا نفاذ متعدد دنوں کو محیط تھا۔ مجرم ڈبلن میں داخل ہوا۔ اس نے مذاکرات کیے، اداکاری کی، عبادت کی، سرزنش کی، رقت انگیز جملے ادا کیے۔ ان میں سے ہر انداز جسے نولان نے ہی پہلے سے متعین کیا تھا، اس کی عظمت کا اظہار بنا۔ سینکڑوں اداکاروں نے سورما کی معاونت کی۔ چند ایک کا کردار پیچیدہ تھا جب کہ باقی کا لمحاتی۔ جو حرکات انھوں نے کیں اور جو باتیں کہیں، تاریخ کی کتب میں، آئرلینڈ کی پرجوش یادداشت میں رقم ہیں۔ کلپیٹرک، تمام تر جزئیات کے ساتھ طے کی گئی اپنی منزل کی طرف، جس نے اس کی تطہیر کی اور اس کو نیست و نابود بھی کر دیا، کہیں زیادہ سبک روی کے ساتھ بہتا چلا گیا۔ ایک سے زائد مرتبہ اس نے اپنے اعمال اور الفاظ سے اپنے مصنف کے مسودے میں ترمیم و اضافہ کیا۔ ۱۸۲۴ء کی اگست کی چھ تاریخ کو یہ کثیر التعداد اداکاروں والا ناٹک احاطہ زمان میں ظہور پذیر ہوا۔

لنکن کی شبیہ والے ماتمی پردوں سے ڈھکے ناٹک گھر کے باکس میں ایک انتہائی متوقع گولی غدار کی چھاتی میں داخل ہوئی۔ وہ دو زخموں سے خون کے فوری اخراج کے باعث چند پیش بین الفاظ ادا کرنے سے بھی قاصر رہا۔

نولان کی تحریروں میں شیکسپیئر سے نقل کی گئی عبارتیں ڈرامائی عنصر سے قریباً تہی ہیں۔ ریان کو شک پیدا ہوا کہ مصنف نے ان میں تحریف کی ہے تا کہ مستقبل میں کوئی ان کی مدد سے حقیقت کو نہ پا سکے۔ وہ سمجھ لیتا ہے کہ وہ خود بھی نولان کے منصوبے ہی کے ایک حصہ کی تکمیل کر رہا ہے۔ چند شدید تاملات کے ایک سلسلے کے بعد وہ اپنی دریافت کو اخفا رکھنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ وہ ایک کتاب شائع کرتا ہے جسے سورما کی عظمت سے منسوب کیا جاتا ہے۔ غالباً اس بات کی بھی پہلے سے پیشین گوئی کی جا چکی تھی۔

خدا کا کلام

عقوبت خانہ گہرا اور پتھر کا بنا ہوا ہے۔ اس کی ہیئت ایک نیم کرے جیسی ہے جب کہ فرش (جو پتھر ہی کا بنا ہوا ہے) ایک بڑے دائرے سے کسی قدر کم ہے۔ یہ ایسی حقیقت ہے جو جبر اور کشادگی کے احساسات کو سنگین بناتی ہے۔ ایک دیوار اسے درمیان میں سے تقسیم کرتی ہے۔ یہ دیوار گو بہت بلند ہے لیکن چھت کی محراب کے بالائی حصے تک نہیں پہنچ پاتی۔ ایک کوٹھڑی میں، میں ہوں، زینا کان، کہولون کے اہرام کا ساحر۔ اس اہرام کو پیڈرو ڈی الورادو نے جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔ دوسری کوٹھڑی میں ایک تیندوا ہے جو اپنے قید خانے کے فرش کو خفیہ انداز سے نپے تلے قدموں کے ساتھ ناپا رہتا ہے۔

ایک لمبی سلاخوں والی کھڑکی فرش سے جڑی ہوئی وسطی دیوار میں بنی ہے۔ بے سایا گھنٹوں کے دوران (دن کے وسط میں) بلند محراب میں ایک دروازہ کھلتا ہے اور ایک داروغہ زنداں، جس کی صورت ان تمام برسوں میں میرے ذہن میں دھندلا گئی ہے، ایک آہنی چرخی گھماتا ہے اور ہمارے لیے غذا کو رسی سے باندھ کر نیچے گراتا ہے۔ یہ پانی کے مرتبان اور گوشت کے قتلوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ روشنی کے گنبد میں ورود ہوتا ہے۔ یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب تیندوا مجھے دکھائی دیتا ہے۔

میں کتنے ہی برسوں سے تاریکی میں پڑا ہوں۔ میں جو کبھی جوان تھا اور اس زندان میں چل پھر سکتا تھا، اب اس کے سوا کسی قابل نہیں رہا کہ اپنی موت کی امید کے ساتھ اپنے انجام کا انتظار کروں جو دیوتاؤں نے میرے مقدر میں لکھ دیا ہے۔ برکانی شیشے کے لابنے خنجر سے میں نے قربان کیے جانے والے جانداروں کے سینے چیر ڈالے۔ اب یہ حال ہے کہ کسی کی مدد کے بغیر خود کو خاک سے اٹھا بھی نہیں سکتا۔

اہرام کو نذر آتش کرنے سے قبل ان آدمیوں نے، جو بلند قامت گھوڑوں سے اترے تھے، مجھ پر آگ میں تپائی ہوئی دھات سے تشدد کیا تا کہ میں ان کو خفیہ مخزن کے درست مقام کی نشان دہی کروں۔ انھوں نے میری آنکھوں کے سامنے دیوتا کے بت کو نیچے گرایا لیکن دیوتا نے مجھے تنہا نہیں چھوڑا۔ میں نے خاموشی کے ساتھ اذیت کو سہا۔ انھوں نے مجھے قید میں ڈالا۔ میرے اعضا توڑ ڈالے اور میری صورت بگاڑ دی۔ مجھے اس قید خانے میں ہوش آیا جس سے میں اس فانی زندگی میں کبھی نجات نہیں پا سکوں گا۔

اس ضرورت سے مجبور ہو کر کہ کرنے کو کچھ ہونا چاہیے اور وقت کو کسی طرح زندہ رکھا جائے، میں نے اپنی تاریکیوں میں وہ سب کچھ یاد کرنے کی کوشش کی جو مجھے معلوم تھا۔ غیر مختتم راتیں میں نے پتھر پر

کھدے سانپوں کی ترتیب اور تعداد یا ایک ادویاتی درخت کی صحیح صورت کو یاد کرنے میں صرف کیں۔ اس طور بہ تدریج میں نے گزرے ہوئے برسوں کو زیرنگیں کر لیا۔ بہ تدریج میں نے وہ سب کچھ پھر سے پالیا جو میری ہی ملکیت تھا۔ ایک رات میں نے محسوس کیا کہ میں ایک بہت نجی یادآوری کی دہلیز کے قریب پہنچ رہا ہوں۔ سمندر کو دیکھ پانے سے پہلے مسافر اپنے خون کی گردش میں تیزی محسوس کرتا ہے۔ گھنٹوں بعد میں نے اس یادآوری کے ہلکے سے خاکے کا ادراک کیا۔ یہ دیوتا کی ایک حکایت تھی۔ تخلیق کے اولین روز دیوتا نے اس پیش آگہی کے تحت کہ وقت کے اختتام پر تباہی کا دور دورہ ہوگا، ایک طلسمی جملہ لکھا جس میں اتنی قوت تھی کہ وہ شر سے محفوظ رکھ سکتا تھا۔ اس نے اسے اس انداز سے لکھا کہ یہ دور دراز کی نسلوں تک پہنچے اور اس میں ذرہ بھر بھی تبدیلی نہ آنے پائے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اسے کہاں لکھا گیا اور نہ یہ کہ کس رسم الخط میں۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ یہ موجود ہے، بہت خفیہ انداز میں۔ ایک منتخب انسان ہی اسے پڑھ سکتا تھا۔

میں نے سوچا کہ ہم ہمیشہ کی طرح زمان کے اختتام پر موجود ہیں اور دیوتا کے آخری پروہت کی حیثیت سے میرا رتبہ مجھے اس تحریر کے وجدان کا شرف بخشے گا۔ اس حقیقت نے کہ قفس کی دیواروں نے مجھے باندھ رکھا ہے، میری امید کو مجروح نہیں کیا۔ غالباً میں کھولون کی تحریر ہزار ہا مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ بس اسے سمجھنے کی ضرورت تھی۔

اس خیال نے میری ہمت بندھائی اور میرے اندر عجیب طرح کی گھمیر کو جنم دیا۔ ساری زمین پر قدیم اشکال موجود ہیں، اشکال جو غیر فانی اور ابدی ہیں۔ میں نے سوچا کہ ان میں سے کوئی ایک خدائی علامت ہو سکتی ہے۔ ایک پہاڑ خدا کا کلام ہو سکتا ہے یا ایک دریا یا ایک سلطنت یا ستاروں کا جھرمٹ۔ لیکن صدیوں کے عمل کے بعد پہاڑ ہموار ہو جاتا ہے اور دریا اپنا راستہ تبدیل کر لیتا ہے۔ سلطنت میں تغیر و تبدل آ جاتا ہے اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جاتی ہے۔ ستاروں کی ترتیب بدلتی رہتی ہے۔ خود آسمان ایک سا نہیں رہتا۔ پہاڑ اور ستارے افراد ہیں اور افراد فنا ہو جاتے ہیں۔ مجھے کسی زیادہ مستحکم شے، کسی زیادہ ناقابل تغیر شے کی تلاش تھی۔ میں نے اناج، گھاس، پرندوں اور انسان کی نسلوں کے بارے میں سوچا۔ شاید وہ سحر میرے چہرے پر لکھا گیا ہو۔ غالباً میں خود ہی اپنا مقصود ہوں۔ یہ اضطراب مجھے جلا رہا تھا۔ میں نے یاد کیا کہ تیندوا بھی تو دیوتا کی صفات میں سے ایک ہے۔

میری روح رحم کے جذبے سے معمور ہو گئی۔ میں نے وقت کی اولین صبح کا تصور کیا۔ میں نے اپنے دیوتا کا تصور کیا جو اپنے پیغام کو تیندوے کی زندہ کھال کو تفویض کر رہا تھا۔ جو جفتی کریں گے اور بغیر اختتام کے غاروں اور جنگلوں میں اور جزیروں پر تولید کا سلسلہ جاری رکھیں گے تاکہ آخری انسان اس پیغام کو موصول

کر سکے۔ میں نے تیندوں کی کھال پر بنے جال اور ان میں موجود کثیر بھول بھلیوں کا تصور کیا جو درگاہوں اور گلیوں میں پھیلتی رہیں تا کہ ایک خاص ڈیزائن کو زندہ جاوید بنایا جا سکے۔ دوسری کوٹھڑی میں ایک تیندوا تھا۔ اپنے پڑوس میں اس کی موجودگی کو میں نے اپنے قیاس کی توثیق اور ایک خفیہ ودیعت کا ادراک سمجھا۔

میں نے بہت سے سال تیندوے کی جلد پر موجود دھبوں کے جمگھٹ کی ہیئت اور ان کی ترکیب کو سمجھنے میں صرف کیے۔ تاریکی کے ہر دور میں روشنی کا ایک لمحہ پنہاں ہوتا ہے۔ یوں میں اس قابل ہوا کہ زرد پوستین پر پھیلی سیاہ شکلوں کو اپنے ذہن میں بٹھا سکوں۔ ان میں سے چند ایک نقطوں پر مشتمل تھیں۔ کچھ ٹانگوں کی اندرونی جانب آڑی ترچھی لکیریں بناتی تھیں۔ کچھ دائرے کی صورت میں تھیں اور ہر جگہ موجود تھیں۔ غالباً وہ محض واحد آواز یا لفظ کی مانند تھیں۔ بیش تر کے کنارے سرخ تھے۔

میں اپنی مشقتوں کی پر تھکن روداد بیان نہیں کروں گا۔ ایک سے زائد مرتبہ میں اس گنبد میں چیخ اٹھا کہ اس تحریر کو پڑھنا غیر ممکن ہے۔ لیکن بہ تدریج اس محسوساتی چیستاں کا، جس پر میں نے مغز ماری کی تھی، الجھاؤ کم ہونے لگا، بہ نسبت اس ایک جملے کے عمومی چیستان کے، جسے دیوتا نے رقم کیا تھا۔ کس نوع کا جملہ (میں نے خود سے پوچھا) ایک ذہن مطلق تشکیل دے سکتا ہے؟ میں نے سوچا کہ انسانی زبان میں کوئی قضیہ ایسا نہیں ہے جس کا اطلاق تمام کائنات پر ممکن نہ ہو۔ لفظ ''تیندوا'' کیا ان تمام تیندووں کے ذکر کے مترادف ہے جو اس لفظ کو جنم دینے کا باعث بنے۔ ہرن اور کچھوے اسی میں ضم ہو جاتے ہیں جنھیں وہ مار کر کھا گیا اور وہ گھاس بھی جسے ہرن غذا کے طور پر استعمال کرتا رہا، وہ زمین بھی جو اس گھاس کو پیدا کرنے والی ہے اور وہ آسمان جس نے زمین کو جنم دیا۔ میں نے غور کیا کہ ایک دیوتا کی لسانیات میں ہر لفظ حقائق کی اس لا انتہا سلسلہ بندی کا دعوے دار ہوگا۔ ڈھکے چھپے انداز میں نہیں بل کہ قطعی طور پر۔ تدریجی طور پر نہیں بل کہ فی الفور ایک وقت ایسا آیا کہ کسی الہامی کلمے کا تصور ہی مجھے طفلانہ اور بے ادبانہ معلوم ہوا۔ میں نے سوچا ایک خدا ایک ہی لفظ ادا کرے گا۔ اس ایک لفظ میں مطلق توانائی ہوگی۔ اس کا ادا کیا ہوا کوئی لفظ بھی کائنات سے یا زمان کی کل مقدار سے کم تر نہیں۔ 'کل'، 'دنیا'، 'کائنات' جیسے لاچار اور ہوش مندانہ انسانی الفاظ تو محض ایک مکمل لفظ اور ان تمام چیزوں کے عکس اور تشبیہیں ہیں جو ایک زبان کے احاطے میں آ سکتی ہیں۔

ایک دن یا ایک رات... میرے دنوں اور راتوں میں بھلا اب کیا امتیاز باقی رہ گیا ہے؟ میں نے خواب دیکھا کہ زندان کے فرش پر ریت کا ایک ذرہ پڑا ہے۔ اسے درخور اعتنا نہ جان کر میں پھر سے سو گیا۔ میں نے خواب دیکھا کہ میں جاگا ہوں اور فرش پر اب ریت کے دو ذرے موجود ہیں۔ میں دوبارہ سو گیا۔

میں نے پھر سے خواب دیکھا کہ ریت کے ذرے اب تین ہو گئے ہیں۔ اس انداز سے وہ بڑھتے چلے گئے حتیٰ کہ زندان ان سے بھر گیا۔ میں ریت کے اس نیم کرے تلے لیٹا مر رہا ہوں۔ میں نے محسوس کیا کہ میں خواب دیکھ رہا تھا۔ سخت کدو کاوش کے بعد میں نے خود کو بلند کیا اور جاگا۔ لیکن بیدار ہونا بے سود رہا۔ لاانتہا ریت میرا دم گھونٹ رہی تھی۔ کسی نے مجھ سے کہا ''تم بیداری کی حالت میں نہیں ہو بل کہ گزشتہ خواب میں بیدار ہوئے ہو۔ یہ خواب ایک دوسرے خواب میں ملفوف ہو گیا ہے اور ایسا لامحدود انداز میں جاری رہے گا۔ جیسے ریت کے ذروں کی تعداد ان گنت ہے، ایسے ہی وہ راستہ جس کو تمھیں کھوجنا چاہیے، غیر مختتم ہے۔ تم حقیقتاً بیدار ہونے سے پہلے ہی مر جاؤ گے۔

میں مایوس ہو گیا۔ ریت سے میرا منھ بھر گیا۔ میں چلایا ''خوابوں کی ریت مجھے قتل نہیں کر سکتی نہ ہی خوابوں کے اندر کوئی خواب ہو سکتے ہیں۔'' روشنی کے ایک جھماکے نے مجھے بیدار کیا۔ تاریکی میں میرے اوپر روشنی کا ایک دائرہ نمودار ہوا۔ مجھے داروغہ زندان کا چہرہ اور ہاتھ، چرخی، رسی، گوشت کے قتلے اور پانی کا مرتبان دکھائی دیا۔

انسان اپنی قسمت کی ہیئت سے بہ تدریج مانوس ہو جاتا ہے۔ وہ خود اپنی حرکات و سکنات کا ماخذ ہوتا ہے۔ معمے حل کرنے والے یا ایک انتقام لینے والے دیوتا کے پجاری سے بڑھ کر میں فقط ایک قیدی تھا۔ خوابوں کی ان تھک بھول بھلیوں سے میں درشت زندان خانے میں واپس آیا جیسے کوئی گھر لوٹتا ہے۔ میں نے اس کی سیلن کو دعا دی۔ تیندوے کو دعا دی۔ اس روزن کو دعا دی جو روشنی کے اندر آنے کا راستہ ہے۔ میں نے اپنے عمر رسیدہ اور دکھتے ہوئے بدن کو دعا دی۔ میں نے تاریکی اور پتھر کو دعا دی۔

تب وہ واقعہ ہوا جسے میں فراموش کر سکتا ہوں اور نہ جسے بیان کر سکتا ہوں۔ یہ واقعہ خدا سے، کائنات سے اتصال کا واقعہ تھا۔ (مجھے علم نہیں ہے کہ آیا ان دونوں الفاظ کے معانی باہم مختلف ہیں) وجد اپنی علامتوں کو دہراتا نہیں ہے۔ کسی نے خدا کو ایک کامل نور میں، کسی نے ایک تلوار میں، اور کسی نے ایک گلاب کی پنکھڑیوں میں دیکھا ہے۔ میں نے ایک غیر معمولی حد تک بلند پہیا دیکھا جو میری آنکھوں کے سامنے نہیں تھا، نہ میرے عقب میں تھا، نہ میری اطراف میں بل کہ بہ یک وقت ہر سمت موجود تھا۔ یہ پہیا پانی سے بنا ہوا تھا لیکن آگ سے بھی۔ اور یہ (اگرچہ اس کے کنارے دکھائی دیتے تھے) غیر محدود تھا۔ وہ سارے ماضی اور حال اور مستقبل سے شکل پذیر ہوا تھا۔ میں اس بنت کی تاروں میں سے ایک تار تھا جب کہ پیدرو دی آلوارِدو، جس نے مجھ پر تشدد کیا، ایک دوسرا تار تھا۔ تب مجھ پر علل اور معلولات کا انکشاف ہوا۔ میرا پہیے کو، جو غیر اختتام پذیر تھا، ایک نظر دیکھنا کافی تھا تا کہ ہر شے کو کلی طور پر سمجھا جا سکے۔ آہ! علم کی

مسرت، کامل تخیل یا احساس کی مسرت سے عظیم تر ہے۔ میں نے کائنات کو دیکھا اور میں نے کائنات کے مخفی گہرے نقش کو دیکھا۔ میں نے ''کتاب ہدایت'' میں کائناتی مبدا و ماخذ سے متعلق آرا دیکھیں۔ میں نے پہاڑوں کو دیکھا جو پانی کی سطح سے ابھر رہے تھے اور میں نے جنگل کے اولین انسانوں کو دیکھا۔ پانی کے حوض دیکھے جوان انسانوں سے خائف ہو کر بہنے لگے تھے۔ کتے جنھوں نے ان کے چہروں کو پامال کر دیا۔ میں نے لاانتہا عمل کو دیکھا جس سے ایک تنہا سرور ہویدا ہو رہا تھا۔ ان سب کا ادراک کرنے کے بعد میں تیندوے کی کھال کی تحریر کو سمجھنے کے قابل ہو گیا۔

یہ چودہ بے ترتیب الفاظ کا ایک منتر تھا (یا شاید وہ بے ترتیبی سے لکھے نظر آتے تھے) ان کا باآواز بلند ادا کرنا مجھ کو بے انتہا طاقت ور بنا دینے کے لیے کافی تھا۔ اس پتھر یلے زندان کو نیست و نابود کرنے، میری رات میں دن کی روشنی بھر دینے، جوان اور لافانی ہو جانے، شیر کے پنجے سے الوادور کو تار تار کروا دینے، مقدس خنجر کے سپیپارڈ کی چھاتیوں میں گاڑ دیے جانے، معبد کی تعمیر نو اور سلطنت کی حیات نو کے لیے ان الفاظ کو ادا کرنا کافی تھا۔ چالیس حروف، چودہ الفاظ اور میں زینا کان، اس قلم رو پر حکومت کروں گا جن پر موتیز ما کا تسلط تھا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ میں ان الفاظ کو کبھی ادا نہیں کروں گا کیوں کہ میں اب زینا کان کو نہیں جانتا۔

کیا تیندوے کی کھال پر رقم اسرار میرے ساتھ ہی فنا ہو جائے گا۔ جس کسی نے بھی کائنات کو دیکھا ہے، جس کسی نے بھی کائنات کی آتشیں تراکیب کا مشاہدہ کیا ہے، وہ اس ایک عام شخص کی حیثیت، اس کی خوش بختیوں اور سیہ بختیوں کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ کبھی وہ خود وہی شخص تھا۔ اب وہ مزید اس کے لیے قابل وقعت نہیں رہا۔

اس دوسرے شخص کی زندگی کے اس کے نزدیک کیا معنی؟ اس دوسرے شخص کی قوم کی اس کے لیے کیا حیثیت؟ کیوں کہ وہ اب کوئی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس منتر کو ادا نہیں کروں گا۔ تاریکی میں لیٹے ہوئے میں خود کو گزرتے دنوں کے ہاتھوں فنا ہو جانے دوں گا۔

جنگ جو اور اسیر

اپنی کتاب لا پوئیسیا (La Pocsia) ۱۹۴۲ء کے صفحہ ۲۷۸ پر کروچے نے پیٹر ڈی ڈیکون کی ایک لاطینی تحریر کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے ڈرا کٹلف کی سرنوشت بیان کی ہے جس میں اس کی قبر کے

کتبے کا بھی ذکر موجود ہے۔

یہ دونوں باتیں مجھے انوکھی معلوم ہوئیں۔ بعدازاں میری سمجھ میں آیا کہ ایسا کیوں تھا؟ ڈرا کلف لامبرڈ کا جنگ جو تھا جو ریوینا کے محاصرے کے دوران اپنے ساتھیوں سے کنارہ کش ہوا اور اسی شہر کا دفاع کرتے ہوئے مارا گیا جس پر حملہ کرنے کے ارادے سے وہ آیا تھا۔ ریوینا کے باشندوں نے ایک معبد میں اسے دفنایا اور اس کی قبر پر شکر گزاری کے اظہار کے طور پر کتبہ لکھ کر نصب کیا جس پر ایک وحشی کے درندہ صفت روپ اور اس کی سادگی اور اچھائی کے بیچ واضح اور عجیب تضاد کو بیان کیا گیا ہے۔

'Terribilis viru facies, sed mente benigus, longaque robusto pectore barba fuit!'

یہ ڈرا کلف کی سرنوشت ہے۔ ایک وحشی جو روم کا دفاع کرتے ہوئے ہلاک ہوا یا پھر ایسی ہی اس کی داستان حیات ہوگی جو پیٹر ڈی ڈیکون ہمارے لیے کھوج نکالنے میں کام یاب ہوا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ یہ واقعہ کب ہوا؟ شاید چھٹی صدی کے وسط میں جب لانگ بارڈی نے اٹلی کے میدانوں کو تاخت و تاراج کیا یا آٹھویں صدی میں ریوینا کے ہتھیار ڈالنے سے قبل۔ ہم اول الذکر تاریخ کو درست مان لیتے ہیں۔ ہم فرض کرتے ہیں کہ ڈرا کلف کوئی فرد نہیں ہے۔ وہ ایک عمیق وجود ہے جیسا کہ ہر فرد ہوتا ہے۔ بل کہ ایک ایسی روایت ہے جو مختلف راویوں کے توسط سے ظہور پذیر ہوئی جیسا نسیان اور یادداشت کے زیر اثر ہوتا ہے۔

جنگلوں اور دلدلوں سے بھرے ایک مبہم خطے میں جنگیں لڑتا ہوا وہ دریائے ڈینیوب اور دریائے ایلبی کے کناروں سے گزر کر اٹلی پہنچا۔ غالباً وہ خود نہیں جانتا تھا کہ وہ جنوب کی طرف رواں تھا اور شاید یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ روم کی ناموس کے تحفظ کی خاطر لڑ رہا تھا۔ غالباً وہ اریانسٹ عقیدے کا پیروکار تھا جس کے مطابق سورج کا جاہ و جلال مقدس باپ کی شبیہ ہے۔ اس کے بارے میں یہ تصور کرنا زیادہ موزوں ہے کہ وہ ہارتھا کا پجاری تھا جس کا نقاب پوش بت بیل گاڑی میں رکھ کر ہر جھونپڑے تک لایا جاتا ہے یا یہ کہ وہ جنگ اور طوفان کے دیوتاؤں کا پجاری تھا جو کندہ ناتراش چوبی شبیہوں کی صورت میں موجود ہیں۔ یہ شبیہیں گھر کے بنے ہوئے لباس میں ملبوس اور سکوں اور کنگنوں کے ساتھ ٹنگی ہوئی ملتی ہیں۔

وہ سور ماؤں اور ارنا سانڈوں کے جنگلات سے آیا تھا۔ وہ نکھری ہوئی جلد والا، پر جوش، معصوم، ظالم اور اپنے کپتان اور قبیلے کا وفادار تھا۔ صرف اپنے کپتان اور قبیلے کا ہی، اور اس سے بڑھ کر کسی گروہ سے اس کا تعلق نہیں تھا۔ جنگیں اسے ریوینا میں گھسیٹ لائیں۔ وہاں اس نے وہ چیز دیکھی جس سے وہ

پہلے کبھی دو چار نہیں ہوا تھا۔ یا کم از کم وہ اس سے یوں پورے طور پر آشنا نہیں ہوا تھا۔
اس نے ون اور سرو کے درخت اور سنگ مرمر کو دیکھا۔ اس نے ایک پھول دیکھا جس کی کثرت انتشار کا شکار نہیں تھی۔ اس نے ایک شہر دیکھا، ایک عضویہ جو مورتیوں، معبدوں، باغوں، کمروں، گول گھروں، آرائشی ظروفوں، ستونوں، باقاعدہ اور کھلے مقامات سے مترکب تھا۔ ان تمام بناوٹی اشیا میں سے (میں جانتا ہوں) کوئی ایک بھی اسے دل کش معلوم نہ ہوئی ہو گی لیکن ان سے وہ اسی انداز سے متاثر ہوا جیسے ہم کسی ایسے پیچیدہ آلے سے متاثر ہوں جس کے مقصد کی تہ تک ہم نہ پہنچ سکیں لیکن جس کی ہیئت میں ہمیں لافانی ذہن کی کارفرمائی محسوس ہو۔ غالباً اس کے لیے اتنا ہی کافی ہوتا کہ وہ ایک محراب کو دیکھ لیتا جس پر رومن الفاظ میں ایک نا قابل فہم عبارت کندہ ہوتی۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں وہ ایک کتے یا ایک بچے کی حیثیت سے زندگی گزارے گا۔ یا وہ اسے کبھی سمجھ نہیں پائے گا۔ لیکن اسے یہ بھی علم تھا کہ یہ اس کے دیوتاؤں، اس کے راسخ عقیدے، اور جرمنی کی تمام دلدلوں سے زیادہ وقیع شے تھی۔ ڈراکٹلف نے اپنے ساتھیوں سے کنارہ کشی اختیار کی اور ریوینا کے لیے لڑا۔ وہ مر گیا تو لوگوں نے اس کی قبر کے کتبے پر یہ الفاظ کندہ کرائے جنھیں وہ کبھی سمجھ نہیں سکے گا۔

"Contemprit caros, dum nos amt ill,parentes,

Hance patrian reputans esse, ravenna, suam".

وہ غدار نہیں تھا۔ (غداروں سے ایسے محترم کتبے منسوب نہیں کیے جاتے۔) وہ ایک اہل دل شخص تھا، ایک منحرف۔ اگلی چند نسلوں میں لانگوبارڈی، جنھوں نے اس نمک حرام کو خوب لعن طعن کی، خود بھی اسی کی راہ پر چل نکلے۔ وہ اطالوی لامبارڈز بن گئے اور شاید ان ہی کی نسل کے آلڈیجر لوگوں نے ان لوگوں کو پیدا کیا جو ایلیگیر یوں کو وجود میں لائے۔
ڈراکٹلف کے اس رویے کے حوالے سے متعدد قیاس آرائیاں ہو سکتی ہیں۔ میرا قیاس انتہائی کفایت شعارانہ ہے۔ ایک حقیقت کے طور پر نہیں بل کہ رمزی اعتبار سے یہ سچ ہوگا۔ جب میں نے کروچے کی کتاب میں اس جنگ جو کی روداد پڑھی تو اس نے مجھے غیر معمولی انداز میں متاثر کیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں نے ایک شے قدرے مختلف صورت میں پھر سے پالی تھی جو میری ہی تھی۔ میں نے فوراً ہی منگول گھڑ سواروں کے بارے میں سوچا جو چین کو ایک لامحدود چراگاہ بنانا چاہتے تھے۔ لیکن جو انھی شہروں میں بوڑھے ہو گئے جن کو پامال کرنے کی انھوں نے خواہش کی۔ تاہم یہ بات میری کسی دوسری یاد سے وابستہ تھی۔ آخر میں نے اسے پالیا۔ یہ ایک قصہ تھا جو میں نے ایک مرتبہ اپنی انگریز دادی سے سنا تھا جو

اب وفات پا چکی ہیں۔

۱۸۷۲ء میں میرے دادا بورخیس بیونس ایریز کی شمال مغربی اور سانتافی کی جنوبی سرحدوں پر کمان دار کی حیثیت سے متعین تھے۔ ان کا ہیڈ کوارٹر جونین میں تھا۔ اس سے آگے ایک دوسرے سے چار پانچ فرسنگ کے فاصلے پر سرحدی چوکیاں واقع تھیں۔ ان سے پرے علاقے کو پامپا کہا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ میری دادی نے نصف حیرت اور نصف طنز کے ساتھ اپنی بدقسمتی کا دکھڑا رویا کہ وہ ایک تنہا انگریز عورت دنیا کے اس دور دراز خطے میں جلاوطن تھی۔ لوگوں نے اسے بتایا کہ وہاں وہ اکیلی نہیں تھی۔ کئی ماہ بعد انھوں نے اسے ایک انڈین لڑکی سے متعارف کروایا جو بہت نرم روی سے بازار میں چل رہی تھی۔ اس نے دو بھڑکیلے رنگوں والے کمبل اوڑھ رکھے تھے اور برہنہ پا تھی۔ اس کے بال سنہری تھے۔ ایک سپاہی نے اس سے کہا کہ ایک انگریز عورت اس سے ملنا چاہتی ہے۔ لڑکی راضی ہوگئی۔ وہ بے خوفی کے ساتھ مگر ہر بات پر شک بھی کرتے ہوئے ہیڈ کوارٹر میں داخل ہوئی۔ اس کے تانبے کے سے رنگ کے چہرے پر، جو وحشی رنگوں سے مزین تھا، اس کی آنکھوں کا رنگ ہلکا نیلا تھا جسے انگریز 'بھورا' بھی کہتے ہیں۔ اس کا جسم ہرن کی طرح لچک دار تھا۔ اس کے ہاتھ مضبوط اور ہڈیالے تھے۔ وہ صحرا سے آئی تھی۔ ہر شے اس کو بہت چھوٹی چھوٹی لگی، دروازے، دیواریں اور فرنیچر۔

غالبًا ایک لمحے کے لیے دونوں عورتوں نے خود کو آپس میں بہنیں محسوس کیا۔ وہ اپنی محبوب سرزمینوں سے بہت دور ایک غیر معمولی ملک میں موجود تھیں۔ میری دادی نے چند سوال پوچھے۔ عورت نے قدرے دشواری کے ساتھ جوابات دیے۔ الفاظ کو سوچتے اور انھیں دہراتے ہوئے جیسے وہ ان کے قدیم ذائقے سے حیران تھی۔ قریب پندرہ برسوں سے اس نے اپنی آبائی زبان نہیں بولی تھی۔ نہ اس کی از سرنو بحالی اس کے لیے سہل تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کا تعلق یارک شائر سے تھا۔ اس کے والدین بیونس ایریز منتقل ہوئے۔ پھر وہ ریڈ انڈینز کے ایک حملے کے دوران انھیں کھو بیٹھی۔ اسے انڈینز اٹھا کر لے گئے۔ اب وہ ان کے سردار کی بیوی تھی جس سے اس کے دو بیٹے تھے اور یہ کہ وہ بہت بہادر انسان تھا۔ یہ ساری باتیں اس نے بھونڈی انگریزی میں بیان کیں جس میں آراکینین یا پامپن زبان کی آمیزش تھی۔ اس کی گفت گو کے پس منظر میں ایک وحشی زندگی کی جھلک صاف محسوس ہوتی تھی۔ گھوڑوں کے سائبان، خشک گوبر سے بھڑکائی ہوئی آگ، جھلسے ہوئے گوشت اور خستہ آنتوں کی ضیافتیں، علی الصبح کی خفیہ ہجرتیں، مویشیوں کے باڑوں پر یورشیں، چیخ پکار اور لوٹ مار، جنگیں، جاگیروں پر برہنہ گھڑسواروں کے کامیاب دھاوے، تعدد ازدواج، عفونت اور توہم پرستی۔ ایک انگریز عورت نے خود کو ایسی بربریت کی سطح تک کیسے گرالیا تھا؟ رحم

اور صدمے کے مارے میری دادی نے اسے سمجھایا کہ وہ واپس نہ جائے اور اسے یقین دلایا کہ وہ اس کی حفاظت کرے گی اور اس کے بچے اس کو واپس دلائے گی۔ لیکن اس عورت نے جواب دیا کہ وہ یہیں خوش تھی۔ وہ اسی رات صحرا کی طرف لوٹ گئی۔ فرانسسکو بورخیس کچھ ہی عرصہ بعد چوہتر لوگوں کے انقلاب میں مارا گیا۔ غالباً تب میری دادی نے اس عورت، جو اسیر ہوئی اور پھر ایک کٹھور براعظم میں منتقل کر دی گئی، کی ذات میں خود اپنی قسمت کا عکس دیکھا ہوگا۔

سنہری بالوں والی انڈین عورت ہر برس جونین یا قاعہ راولی میں قصباتی دکانوں سے زیورات یا میٹ بنانے کا سامان خریدنے آتی تھی۔ میری دادی سے گفت گو کے بعد وہ پھر کبھی نہ آئی۔ بعد میں ایک مرتبہ انھوں نے اسے دیکھا۔ ایک روز میری دادی شکار کھیلنے گئی۔ مویشیوں کے باڑے میں بھیڑوں کو نہلانے کی ڈھلان پر ایک شخص ایک جان ور کو ذبح کر رہا تھا۔ پھر جیسا کہ یہ سب کسی خواب کا حصہ ہو، وہی انڈین عورت ایک گھوڑے پر سوار وہاں آئی۔ اس نے خود کو زمین پر گرایا اور گرم خون غٹا غٹ پی گئی۔ میں نہیں جانتا کہ اس نے یہ کس لیے کیا؟ شاید اس لیے کہ اس کے سوا وہ اور کیا کر سکتی تھی یا کسی الٹی میٹم یا کسی اشارے کے طور پر۔

ڈراکللف اور اس اسیر عورت کے درمیان ایک ہزار تین سو برس اور ایک سمندر حائل ہے۔ یہ دونوں اب مساوی طور پر ناقابل رسائی ہیں۔ اس وحشی کی شبیہ جو ریوینا کے دفاع میں لڑا اور اس یورپی عورت کی شبیہ جس نے صحرا کا انتخاب کیا، یہ ہم مختلف معلوم ہوتی ہیں۔ پھر بھی دونوں ایک خفیہ ترغیب کی زد میں آئے۔ ایک ترغیب جو عقل سے زیادہ گہری ہے۔ دونوں اس ترغیب سے سحر زدہ ہوئے جس کے متعلق وہ کبھی نہ جان سکے کہ آخر اس کا کیا جواز ہو سکتا ہے؟ شاید یہ کہانیاں جنھیں میں نے آپس میں جوڑا ہے، ایک ہی کہانی ہے۔ اس سکے کا سامنے کا اور عقبی رخ، خدا کے لیے ایک ہی ہے۔

شاخ دار رستوں والا باغ

لڈل ہارٹ کی ''تاریخ جنگ عظیم اول'' کے صفحہ بائیس پر آپ کو لکھا ملے گا کہ ۲۴ جولائی ۱۹۱۶ء کو سیرے مونٹابن سرحد پر تیرہ برطانوی ڈویژنوں (جن کے ہم راہ چودہ سو توپیں بھی تھیں) کے ساتھ حملے کا منصوبہ بنایا گیا تھا لیکن جسے بعدازاں ۲۹ جولائی کی صبح تک مؤخر کر دیا گیا۔ کیپٹن لڈل ہارٹ کے مطابق اس التوا کا سبب غیر متوقع تند تیز بارشیں تھیں۔ لیکن یہ اس واقعہ کی ایک کم زور تاویل ہے۔

درج ذیل عبارت، جسے تسنگ تاؤ کے ہیشول کے مکتب میں انگریزی کے ایک سابقہ پروفیسر ڈاکٹر یوسون نے رقم کیا اور اسے دوبارہ پڑھنے کے بعد اس پر دست خط کیے، اس معاملے پر واضح انداز میں روشنی ڈالتی ہے۔ اس دستاویز کے ابتدائی دو صفحات غائب ہیں۔

''...اور میں نے فون کا ریسیور نیچے رکھ دیا۔ فوراً ہی میں نے وہ آواز پہچان لی جس نے جرمن زبان میں مجھے مخاطب کیا تھا۔ یہ کیپٹن رچرڈ میڈن تھا۔ وکٹر رونبرگ کے فلیٹ میں میڈن کی موجودگی کا مطلب تھا کہ ہماری پریشانیوں کا اختتام ہو چکا تھا جب کہ یہ بات میرے لیے ثانوی اہمیت کی حامل تھی یا ہونی چاہیے تھی کہ اس کا مطلب ہماری زندگیوں کا خاتمہ بھی تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ رونبرگ گرفتار ہو چکا یا مارا جا چکا تھا۔ آج غروب آفتاب سے پہلے پہلے میں خود بھی اسی انجام سے دوچار ہو جاؤں گا۔ میڈن ایک سخت دل شخص ہے یا پھر یہ اس کی مجبوری ہے کہ وہ ایسا ہو۔ وہ مملکت انگلستان کا ملازم اور ایک آئرش ہے۔ ایسا شخص جس پر غیر ذمہ داری اور غالباً غداری کے الزامات بھی لگائے جا چکے ہیں۔ بھلا ایسے معجزانہ خوش بختی پر شکر گزار نہ ہونے اور اسے استعمال نہ کرنے کی غلطی وہ کس طرح کر سکتا تھا۔ جرمن رائخ کے دو جاسوسوں کی گرفتاری اور میری موت، کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

میں اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ احمقانہ طور پر دروازے کو مقفل کیا اور خود کو پشت کے بل تنگ آہنی کھاٹ پر گرا لیا۔ کھڑکی سے مجھے مانوس چھتیں اور بادلوں سے ڈھکا ہوا چھ بجے کا سورج دکھائی دیا۔ مجھے یہ بات حیرت انگیز معلوم ہوئی کہ آج کا دن میری موت کا دن تھا۔ میرے ساتھ میرے مرحوم باپ کا حوالہ شامل ہے۔ میرا تعلق ہائی فنگ کے آراستہ باغ سے بھی ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں مر جاؤں گا؟

میں نے سوچا ایک انسان کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے، اس کے تخم واضح طور پر لمحہ موجود میں پنہاں ہوتے ہیں۔ صدیاں گزر گئیں لیکن جو کچھ بھی ہوا، بس حال ہی میں ہو رہا ہے۔ ان گنت انسان موجود ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے، وہ فقط میری ذات سے وابستہ ہے۔ میڈن کے گھوڑے سے مشابہ چہرے کی ناقابل برداشت یاد نے میری ان آوارہ خیالیوں کو کافور کیا۔ نفرت اور دہشت کی کیفیت کے درمیان (اپنی اس دہشت کا ذکر کرنا اب میرے لیے بے معنی ہے کیوں کہ میں رچرڈ میڈن کا ٹھٹھا اڑا چکا ہوں اور میری گردن پھانسی کے پھندے کی آرزومند ہے) مجھ پر انکشاف ہوا کہ بلاشبہ اس بے انتہا مسرور جنگ جو کو یہ گمان بھی نہیں ہے کہ میرے پاس کوئی راز موجود ہوگا، دریائے اینکر پر نئے برطانوی توپ خانے کے صحیح مقام کا راز۔ ایک پرندہ تیزی سے لہراتا ہوا بھورے آسمان پر سے گزرا اور میں نے بے ساختہ اسے ایک ہوائی جہاز سے تعبیر کیا۔ پھر اس جہاز کو بہت سے جہازوں سے (فرانسیسی

آسمان پر) جو فوجی چھاؤنی کو عموداً بموں سے نیست و نابود کر رہے ہیں۔ کاش میرے منھ سے، اس سے پیش تر کہ گولی اسے پاش پاش کر دے، یہ خفیہ نام ادا ہو اور جرمنی میں اسے سن لیا جائے تو.... لیکن میری انسانی آواز بہت کم زور ہے۔ کیسے میں اسے چیف کے کانوں تک پہنچا سکتا ہوں۔ اس لاغر اور قابل نفرین انسان کے کانوں تک جو رونبرگ اور میرے بارے میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا کہ ہم سٹیفورڈ شائر میں ہیں۔ وہ برلن میں اپنے ویران دفتر میں بے کار ہی ہماری رپورٹ کے انتظار میں بلا ناغہ اخبارات کو کھنگالتا رہتا ہے۔ میں نے با آواز بلند کہا ''میں فرار ہو جاؤں گا۔'' پھر آواز پیدا کیے بغیر اٹھ بیٹھا، مکمل بے ثمر خاموشی کے ساتھ، جیسے میڈن میری گھات لگائے بیٹھا ہو۔ پھر شاید ایک لاحاصل دکھاوے کی خاطر کہ اب میرے پاس کچھ نہیں بچا، میں نے اپنی جیبوں میں ٹٹولا۔ مجھے وہی کچھ ملا جس کی مجھے توقع تھی۔ ایک امریکی گھڑی، ایک نکل کی زنجیر اور ایک مربع نما سکہ، رونبرگ کے اپارٹمنٹ کا شامل تفتیش بے فائدہ چابیوں کا چھلا، ایک نوٹ بک، ایک خط جس کو میں نے فوری طور پر ضائع کرنے کا فیصلہ کیا، (تاہم میں ایسا کبھی نہ کر سکا) ایک کراؤن، دو شیلنگ اور چند پنس، سرخ اور نیلی پنسل، دستی رومال، ایک پستول جس میں ایک گولی بھری تھی۔ احمقانہ طور پر میں نے اسے ہاتھ میں تھاما اور خود میں جرأت پیدا کرنے کی خاطر اس کو جھلاتے ہوئے تولنے لگا۔ پھر مبہم طور پر سوچا کہ پستول سے دی گئی رپورٹ تو دور دراز فاصلے پر سنی جا سکتی ہے۔ دس منٹ میں میرا منصوبہ مکمل ہو چکا تھا۔ ٹیلی فون ڈائریکٹری میں اس واحد شخص کا نام لکھا تھا جسے یہ پیغام پہنچانے کا کام کرنا تھا۔ وہ فینٹن کے مضافات میں رہتا تھا۔ یہ جگہ ٹرین کے آدھے گھنٹے سے بھی کم سفر پر واقع تھی۔

میں ایک بزدل آدمی ہوں۔ یہ میں اب کہہ رہا ہوں۔ اب جب کہ میں اس منصوبہ کو مکمل کر چکا ہوں جس کی پرخطر نوعیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، میں جانتا ہوں کہ اس کی سزا ہولناک ہے۔ میں نے یہ سب کچھ جرمنوں کے لیے نہیں کیا۔ نہیں۔ ایک بربریت پسند ملک کے لیے میرے دل میں کوئی عزت نہیں جس نے مجھے ایک جاسوس ہونے کی خواری میں مبتلا کیا۔ البتہ میں انگلستان کے ایک باشندے کو جانتا ہوں جو ایک نفیس انسان ہے اور میرے لیے کسی طور گوئٹے سے کم عظیم نہیں ہے۔ مجھے بہ مشکل گھنٹا بھر ہی اُس سے گفت گو کا موقع ملا۔ اس دوران وہ میرے لیے گوئٹے جیسا ہی عظیم رہا۔ بہ ہر حال میں نے یہ سب کچھ اسی لیے کیا کیوں کہ مجھے محسوس ہوا کہ چیف کسی باعث میری قوم کے لوگوں سے خائف ہے۔ میرے لاتعداد آباؤ اجداد میرے اندر حلول کر چکے تھے۔ میں اُسے باور کرانا چاہتا تھا کہ زرد قوم کا شخص اپنی فوجوں کا دفاع کر سکتا ہے۔

مجھے کیپٹن میڈن سے بھی فرار ہونا تھا۔ اس کے ہاتھ اور آواز کسی بھی لمحہ میرے دروازے تک پہنچ سکتے تھے۔ میں نے خاموشی سے لباس پہنا۔ آئینے میں دیکھتے ہوئے خود کو الوداع کہا۔ پرسکون گلی کا بغور جائزہ لیا اور باہر نکل آیا۔ سٹیشن میرے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن میں نے ٹیکسی لینے میں دانش مندی جانی۔ خود کو یہ کہہ کر مطمئن کیا کہ اس سے مجھے دیکھ لیے جانے کا امکان کم ہو جائے گا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس ویران گلی میں مجھے اپنا آپ بالکل واضح دکھائی دینے والا اور غیر محفوظ لگا اور غیر محدود بھی۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ڈرائیور کو سٹیشن کے پرسکون دکھائی دیتے داخلی پھاٹک سے کچھ فاصلے پر ہی رکنے کو کہا۔ میں بالقصد اور ایک طرح کی پراذیت آہستگی سے باہر نکلا۔ مجھے ایشگرو گاؤں تک جانا تھا۔ لیکن میں نے اس سے کہیں زیادہ فاصلے کا ٹکٹ لیا۔ ٹرین کو اگلے چند منٹوں میں ہی یعنی ساڑھے نو بجے چھوٹنا تھا۔ پلیٹ فارم پر کوئی نہیں تھا۔ میں ریل کے ڈبوں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ مجھے یاد ہے چند کسان اور ایک عورت ماتمی لباس میں ملبوس بیٹھی تھی۔ ایک نوجوان جو ایک زخمی اور ضرور فوجی تھا، ٹیسیٹس کا "Annals" پڑھ رہا تھا۔ بالآخر ڈبوں کو جھٹکا لگا۔ ایک شخص جسے میں پہچانتا تھا بے سود ہی پلیٹ فارم کے اختتام پر بھاگ رہا تھا۔ وہ کیپٹن رچرڈ میڈن تھا۔ میں اندر سے شکستہ، کانپتا ہوا کھڑکی سے دُور نشست کے پرلے کنارے پر سمٹ گیا۔

اس شکستگی کی کیفیت میں، میں نے ایک طرح کے اسفل سرور کی کیفیت پائی۔ میں نے خود سے کہا کہ جنگ تو شروع ہو چکی ہے اور قسمت کے پھیر سے آئندہ چالیس منٹ کے لیے میں پہلا مقابلہ حریف کے وار کو خالی دے کر جیت چکا ہوں۔ میں نے خود کو تسلی دی کہ میرا بزدلانہ سرور یہ ثابت کرتا ہے کہ میں کسی مہم کو کامیابی سے سر کرنے کے اہل ہوں۔ اس نقاہت سے میں نے طاقت حاصل کی جو مجھ میں کبھی ختم نہ ہوئی۔ مجھے پیش آگہی ہوئی کہ انسان آئندہ روز بہ روز زیادہ دہشت پسندانہ سرگرمیوں میں مصروف ہو جائے گا۔ جلد ہی یہاں جنگ جوؤں اور رہزنوں کے سوا کوئی باقی نہیں بچے گا۔ میں انھیں یہ مشورہ دیتا ہوں: ایک بدفعل کرنے والے کو یہ سوچ لینا چاہیے کہ وہ اس فعل کو دہرا چکا ہے۔ ایک قبیح مہم پر نکلنے والے شخص کو یہ فرض کر لینا چاہیے کہ وہ اسے پہلے سے ہی کیے بیٹھا ہے۔ اسے مستقبل کو اسی طور خود پر مسلّط کر لینا چاہیے جیسے ماضی ہم پر مسلط ہے۔ سو میں آگے بڑھتا رہا اور میری آنکھیں، جو ایک مرے ہوئے شخص کی آنکھیں تھیں، دن کو غروب ہوتے دیکھتی رہیں جو غالباً میری زندگی میں آخری غروب آفتاب تھا اور رات کا پھیلاؤ بڑھتا رہا۔ ٹرین دیودار کے درختوں کے درمیان ہموار انداز میں بھاگتی رہی۔ پھر کھیتوں کے عین وسط میں آ کر تھم گئی۔ کسی نے سٹیشن کا نام نہیں پکارا۔ میں نے پلیٹ فارم پر موجود چند لڑکوں سے پوچھا "ایشگرو؟" انھوں نے جواب دیا "ایشگرو۔" میں نیچے اتر آیا۔

پلیٹ فارم پر ایک قمقمہ روشنی پھیلا رہا تھا۔لڑکوں کے چہرے سائے میں تھے۔ کسی نے مجھ سے پوچھا "کیا آپ ڈاکٹر سٹیفن کے گھر جا رہے ہیں؟" میرے جواب کا انتظار کیے بغیر ایک دوسرے شخص نے کہا "ان کا گھر یہاں سے بہت دور ہے۔ اگر آپ اس راستے پر بائیں ہاتھ چلیں اور ہر موڑ پر بائیں جانب مڑتے رہیں تو..." میں نے ایک سکہ ان کی طرف اُچھالا (جو میری آخری پونجی تھی)۔ پتھر کی چند سیڑھیاں نیچے اُتر کر میں خاموش سڑک پر چلنے لگا۔ پھر آہستگی سے پہاڑی سے نیچے اُتر گیا۔ پورا چاند میری ہم راہی میں چلتا محسوس ہو رہا تھا۔

ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ رچرڈ میڈن نے کسی طور میرے اُمید شکن منصوبے کی سُن گن لی تھی۔ لیکن فوراً ہی میں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ ناممکن تھا۔ ہمیشہ بائیں جانب مڑ جانے کی ہدایت پر مجھے یاد آیا کہ کسی خاص بھول بھلیوں کے مرکزی نقطے کو دریافت کرنے کے لیے عموماً ایسا ہی طریقہ کار اختیار کیا جاتا ہے۔ مجھے بھول بھلیوں کا کچھ فہم ہے اور اس کی ایک وجہ ہے کہ میں تسوئی پن کا پڑپوتا ہوں۔ وہ ینان کے گورنر تھے۔ انھوں نے ایک ناول لکھنے کے لیے، جو "ہنگ لا مینگ" (Hung La Meng) سے کہیں زیادہ ضخیم ہو سکتا تھا اور ایک بھول بھلیاں تشکیل دینے کے لیے جس میں تمام انسان گم ہو جائیں، اپنے عہدے سے کنارا کشی اختیار کر لی۔ تیرہ برس ان سرگرمیوں میں صرف کیے۔ لیکن ایک اجنبی نے ان کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ ان کا ناول بے ربط تھا اور کسی کو وہ بھول بھلیاں نہ ملیں۔ درختوں کے تلے میں نے اِن گم شدہ بھول بھلیوں کے بارے میں غور و خوض کیا۔ میں نے اپنے تصور میں انھیں ایک پہاڑ کی خفیہ گپھا میں مکمل اور غیر متغیر حالت میں دیکھا۔ میں نے تصور کیا کہ یہ چاول کے کھیتوں میں یا پانی کے نیچے محو ہو گئی تھیں۔ میں نے تصور میں ان کو لامحدود طور پر پھیلا ہوا دیکھا۔ یہ ہشت اضلاع خیموں اور واپسی کے راستوں سے مترکب نہیں تھیں بل کہ دریاؤں اور صوبوں اور بادشاہتوں پر مشتمل تھیں۔ میں نے متعدد بھول بھلیوں والی بھول بھلیوں کے بارے میں سوچا۔ ایک لہردار وسیع بھول بھلیاں جو ماضی اور مستقبل کا احاطہ کر لیں اور کسی طور ستاروں کو بھی محیط ہو جائیں۔ میں ان التباسی شبیہوں میں ایسا کھویا کہ اپنی طے شدہ منزل کو فراموش کر بیٹھا۔ میں نے خود کو وقت کے ایک غیر معلوم وقفہ تک دنیا کا ایک مجرد مدرک محسوس کیا۔ اس ابہام، قصبے، چاند اور دن کی باقیات نے مجھ پر اثر کیا اور سڑک کی ڈھلوان نے بھی جس نے مجھ میں پژمردگی کے سب امکان ختم کر دیے۔ سہ پہر بہت قریب اور لامحدود محسوس ہوئی۔ سڑک منتشر معلوم ہوتی مرغزاروں میں اتر رہی اور شاخ در شاخ تقسیم ہو رہی تھی۔ اونچے سُروں میں قدرے واضح موسیقی مجھ تک پہنچ رہی اور فاصلے اور پتوں کے باعث مدہم ہوتی ہوا کے رخ بدلنے سے پیچھے ہٹتی محسوس ہوتی تھی۔

میں نے سوچا کہ ایک انسان دوسرے انسان کا دشمن تو ہوسکتا ہے۔لیکن ایک پورے ملک سے دشمنی نہیں کر سکتا۔نہ ہی اس کے جگنوؤں، جنگلوں، باغوں، ندیوں اور غروب آفتاب کے منظروں سے۔یوں ہی چلتے ہوئے میں ایک کشادہ زنگ خوردہ پھاٹک کے سامنے پہنچا۔آہنی سلاخوں کے درمیان مجھے درختوں کا ایک کنج اور ایک شہ نشین دکھائی دیا۔فوری طور پر مجھے دو باتیں سمجھ میں آئیں۔پہلی نہایت ادنیٰ اور دوسری قدرے ناقابل یقین۔شہ نشین سے موسیقی سنائی دے رہی تھی، چینی موسیقی۔مجھے یاد نہیں آتا کہ وہاں گھنٹی کا بٹن تھا یا میں نے اپنے ہاتھ سے دستک دی تھی۔موسیقی کی آب و تاب بہ دستور قائم تھی۔

گھر کے اندر پچھواڑے سے ایک لالٹین میری طرف آتی دکھائی دی۔ایک لالٹین جو کبھی تو درختوں کو روشن کر دیتی اور کبھی انھیں گرہن زدہ بنا دیتی۔کاغذی لالٹین جس کی شکل ڈھول جیسی اور رنگ چاند جیسا تھا۔ایک دراز قد شخص نے اسے اٹھایا ہوا تھا۔مجھے اس کا چہرہ دکھائی نہیں دیا۔روشنی نے میری آنکھیں چندھیا دیں۔اس نے دروازہ کھولا اور میری ہی زبان میں آہستگی سے کہا"میں جانتا ہوں کہ پارسا ہاپینگ میری تنہائی کے خاتمہ پر مصر ہیں۔آپ بلاشبہ باغ دیکھنا چاہتے ہیں۔"

میں نے نام پہچان لیا۔یہ ہماری قونصل خانے کے عملے میں سے کسی کا تھا۔میں نے بے پروائی سے جواب"باغ"۔

"شاخ دار راستوں والا باغ۔"

میری یادداشت میں کچھ ہلچل سی ہوئی۔میں نے ناقابل فہم حقیقت کے ساتھ کہا"میرے تسوئی پن کا باغ۔"

"آپ کے آباؤاجداد...آپ کے نامی گرامی آباؤاجداد۔آپ اندر تشریف لائیے۔"

بوجھل راستہ میرے بچپن کی طرح ٹیڑھا میڑھا تھا۔ہم شرقی اور مغربی علوم کی کتابوں سے بھرے کتب خانے میں پہنچے۔میں نے زرد ریشم کی جلد بندی میں گم گشتہ Encyclopedia کے نسخوں کو پہچان لیا جسے لرمینس شاہی خاندان کے تیسرے شہنشاہ نے مرتب کیا تھا اور جس کے چھپنے کی کبھی نوبت نہیں آئی۔

سٹیفن البرٹ مسکراتے ہوئے مجھے دیکھ رہا تھا۔جیسا کہ میں نے پہلے کہا اس کا قد دراز، نقوش تیکھے، آنکھیں بھوری اور داڑھی بھورے رنگ کی تھی۔اس نے مجھے بتایا کہ وہ چینی ثقافت اور زبان سیکھنے سے بہت پہلے ٹینٹسن میں ایک مبلغ تھا۔

ہم بیٹھ گئے۔میں ایک پست قد کشادہ دیوان پر۔لیکن وہ ایک بڑے دائروی گھڑیال کی طرف پشت کیے کھڑا رہا۔میں نے حساب لگایا کہ میرا متلاشی رچرڈ میڈن مجھ تک ایک گھنٹے سے پہلے نہیں پہنچ

سکتا۔ میرا ناقابلِ تنسیخ ارادہ اس کا انتظار کر سکتا تھا۔

''کیسی حیرت انگیز قسمت تھی تسوئی پن کی۔'' سٹیفن البرٹ نے کہا ''وہ اپنے آبائی قصبے کا گورنر، علم ہیئت اور علم نجوم کا ماہر، اور مذہبی کتابوں کی شرح و بسط میں اسے کمال حاصل تھا۔ شطرنج کا کھلاڑی، معروف شاعر اور خطاط۔ لیکن وہ ان تمام چیزوں سے ایک کتاب اور بھول بھلیاں تخلیق کرنے کے لیے دست بردار ہو گیا۔ اس نے اپنے جسم، بستر، شاہی ضیافتوں اور حتیٰ کہ اپنے تبحرِ علمی کے تلذذ سے کنارہ کشی اختیار کر لی، خود کو روشن خلوت والے خیمے میں تیرہ سال تک مقید رکھنے کے لیے۔ جب اس کا انتقال ہوا تو اس کے لواحقین کو بے ترتیب مسودوں کے سوا کچھ نہ ملا۔ اس کا خاندان جیسا کہ آپ جانتے ہوں گے، ان مسودوں کو آگ میں جھونکنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے دوست نے، جو تاؤمت یا بدھ مت کا راہب تھا، ان کی اشاعت پر اصرار کیا۔''

''ہم تسوئی پن کی اولاد'' میں نے جواب دیا، ''اب بھی اس راہب پر لعنت بھیجتے ہیں۔ ان کی اشاعت کی تجویز نا قابلِ فہم تھی۔ وہ کتاب باہم متضاد مسودوں کا ایک مبہم ڈھیر تھی۔ ایک بار میں نے ان کا جائزہ لیا تھا۔ تیسرے باب میں ہیرو مر جاتا ہے۔ چوتھے باب میں وہ زندہ ہے۔ اور پھر تسوئی پن کا دوسرا کارنامہ۔ اس کی بھول بھلیاں...''

''یہاں تسوئی پن کی بھول بھلیاں ہیں۔'' اس نے ایک لمبے سنہری پالش والے ڈیسک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ایک ہاتھی دانت کی بھول بھلیاں'' میں چلایا ''ایک مختصر ترین بھول بھلیاں۔'' ''استعاروں کی بھول بھلیاں' اس نے اصلاح کی، ''وقت کی غیر مرئی بھول بھلیاں۔ مجھ جیسے ایک بربریت پسند انگریز کو اس صاف شفاف راز کے انکشاف کے قابل سمجھا گیا۔ قریب سو سے زائد برسوں کے بعد تفصیلات ناممکن الحصول ہو جاتی ہیں۔ لیکن یہ قیاس کرنا مشکل نہیں ہے کہ کیا ہوا تھا؟ تسوئی پن نے ایک بار کہا تھا، 'میں ایک کتاب لکھنے کے لیے سب کچھ چھوڑ رہا ہوں۔' ایک دوسرے موقع پر کہا، 'میں ایک بھول بھلیاں تعمیر کرنے کے لیے دست بردار ہو رہا ہوں۔' ہر کسی نے انھیں دو الگ الگ کام سمجھا۔ روشن خلوت کی شہ نشین باغ کے وسط میں ایستادہ ہے جو غالباً پیچیدہ تھی۔ یہ صورت حال اس کے ورثا کے لیے ایک مادی بھول بھلیوں کی نشان دہی کر سکتی تھی۔ تسوئی پن مر گیا۔ اس کے ماتحت وسیع و عریض علاقے میں کوئی اس بھول بھلیوں تک نہیں پہنچا۔ ناول کی پیچیدگی سے مجھے اشارہ ملا کہ یہی بھول بھلیاں ہیں۔ دو مختلف صورت احوال نے مجھے اس مسئلہ کے درست حل تک پہنچایا۔ اوّل یہ اسطورہ کہ تسوئی نے ایسی بھول بھلیاں

تخلیق کرنے کا منصوبہ بنایا ہے جو لامحدود ہوں گی۔ دوم ایک خط کا اقتباس جو میں نے دریافت کیا۔''

البرٹ اٹھا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے اپنی پشت میری جانب پھیری اور ایک سیاہ اور سنہری میز کا دراز کھولا۔ پھر میری طرف مڑا۔ اس کے ہاتھوں میں کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا جو کبھی ارغوانی رنگ کا رہا ہو گا۔ لیکن اب گلابی اور مہین، اور قطعوں میں تقسیم تھا۔ تسوئی پن کی خطاط کی حیثیت سے شہرت بے جا نہیں تھی۔ میں نے پڑھا لیکن بے سمجھی کے ساتھ اور گہرے شغف سے۔ یہ الفاظ میرے ہی سلسلہ نسب کے ایک انسان نے باریک برش سے لکھے تھے۔ میں متعدد مستقبلوں کے لیے (سب کے لیے نہیں) اپنا شاخ دار راستوں والا باغ چھوڑ کر جا رہا ہوں۔'' کوئی لفظ کہے بغیر میں نے وہ صفحہ اسے لوٹا دیا۔ البرٹ نے بیان جاری رکھا۔

''اس خط کا مفہوم جاننے سے پہلے میں نے خود سے سوال کیا کہ کن صورتوں میں ایک کتاب لا انتہا ہو سکتی ہے۔ میں ایک حلقہ دار کتاب کے سوا اور کچھ نہ سوچ سکا۔ ایک دائروی کتاب۔ ایک کتاب جس کا آخری صفحہ پہلے سے مشابہ ہو۔ ایک کتاب جس میں لامحدود طور پر مسلسل ہونے کا امکان موجود ہو۔ مجھے وہ رات بھی یاد آئی جو الف لیلہ کے درمیان کہیں موجود ہے جب شہرزاد (جو نقل کنندہ کی جادوئی سہو کے ذریعے) ایک ہزار اور ایک راتوں کی کہانی لفظ بہ لفظ بیان کرنے لگتی ہے اور یہ خدشہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ وہ پھر سے اسی رات پر آ جائے گی۔ میں نے افلاطونی موروثی مسودہ کا بھی تصور کیا جو باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتا رہا اور جس میں ہر اگلا شخص پُر خلوص احتیاط کے ساتھ اضافہ یا ترمیم کرتا رہے گا۔ ان قیاس آرائیوں نے میری توجہ کو منحرف کیا۔ لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی مجھے تسوئی پن کے متناقص ابواب سے مماثل معلوم نہ ہوئیں۔ اسی الجھن کے دوران مجھے اوکسفرڈ سے یہ مسودہ موصول ہوا جسے ابھی آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ قدرتی طور پر میں اس فقرے پر پس و پیش کرتا رہا ''میں متعدد مستقبلوں کے لیے (سب کے لیے نہیں) اپنا شاخ دار راستوں والا باغ چھوڑے جا رہا ہوں۔' پھر بالکل اتفاق سے ہی میں نے اسے سمجھ لیا۔ وہ 'شاخ دار رستوں والا باغ' یہی بے ترتیب ناول تھا۔ اس فقرے نے کہ 'متعدد مستقبلوں (لیکن سب کے لیے نہیں)' مجھ پر آشکار کیا کہ یہ شاخ داری زمانی ہے، مکانی نہیں۔ مسودے کے بہ غور مطالعہ نے مجھ پر اس نظریہ کو حتمی طور پر واضح کیا۔ تمام ادبی مسودوں میں انسان کو ایک سے زائد متبادلات کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ کسی ایک کا انتخاب کرتا اور باقیوں کو رد کر دیتا ہے۔ تسوئی پن کے ادب میں ایک ہی وقت میں سبھی متبادلات کا انتخاب کیا گیا ہے۔ یوں وہ گونا گوں مستقبل اور گونا گوں زمان تخلیق کرتا ہے جو بہ جائے خود ایک ہی پودے سے پھوٹنے والا اور شاخ دار ہے۔ صرف اسی میں ناول کے تناقضات کی تشریح موجود

ہے۔مثلاً میں کہتا ہوں کہ فانگ کے پاس ایک راز ہے۔ایک اجنبی اس کے دروازے پر آتا ہے۔فانگ اسے قتل کرنے کا ارادہ کرلیتا ہے۔قدرتی طور پراس کے متعدد نتائج برآمد ہوں گے۔فانگ اس ناخواندہ مہمان کو قتل کرسکتا ہے۔وہ مہمان فانگ کو قتل کرسکتا ہے۔وہ دونوں فرار ہو سکتے ہیں۔وہ دونوں مر سکتے ہیں۔علیٰ ہذالقیاس۔

تسوئی پن کے مسودے میں تمام ممکنہ صورتیں موجود ہیں۔ ہر شاخ دوسری شاخ کے لیے علاحدگی کا نقطہ ہے۔کبھی کبھاران بھول بھلیوں کے راستے مائل بہ اتصال معلوم ہوتے ہیں۔مثال کے طور پر آپ اس گھر تک پہنچتے ہیں۔لیکن ماضی کی ایک ممکنہ صورت میں آپ میرے دشمن بھی ہو سکتے ہیں اور ایک دوسری صورت میں دوست بھی۔اگر آپ میرے ناقابلِ اصلاح تلفظ پر قانع ہو سکیں تو میں آپ کو چند صفحے پڑھ کر سناؤں۔''

لیمپ کی روشنی کے چنچل دائرے میں اس کا چہرہ بلاشبہ ایک بوڑھے کا چہرہ معلوم ہو رہا تھا۔لیکن اس پر کچھ حتمی تاثر بھی تھا جیسے وہ غیر فانی ہو۔اس نے کچھ کچھ درشتگی کے ساتھ ایک ہی رزمیہ باب کے دو ترجمے پڑھے۔ پہلے باب میں ایک فوج ایک تنہا پہاڑ کے پار جنگ کے لیے جاتی ہے۔ چٹانوں اور سایوں کی دہشت جوانوں کو اپنی زندگیوں کی کم مائیگی کا احساس دلاتی ہے اور وہ ایک آسان فتح حاصل کر لیتے ہیں۔ دوسرے میں وہی فوج افقی بلندی پر ایک محل سے گزرتی ہے جہاں ایک عظیم میلہ برپا ہے۔تاہاں جنگ اسے اسی جشن کا ایک تسلسل معلوم ہوتی ہے اور وہ فتح حاصل کرتی ہے۔ میں نے ان قدیم کہانیوں کو مناسب تعظیم کے ساتھ سنا۔ ذاتی حیثیت میں وہ غالباً اتنی قابلِ تحسین نہ ہوتیں، اگر وہ میرے ہی خاندان کے ایک آدمی نے تخلیق نہ کی ہوتیں اور انھیں مجھ کو ایک مغربی ٹاپو پر ایک مایوس کن مہم کے دوران ایک دُور دراز کے ملک کے فرد نے بیان نہ کیا ہوتا۔ مجھے وہ اختتامی الفاظ یاد ہیں جنھیں ہر ترجمے میں ایک خفیہ حکم ربانی کے طور پر دہرایا گیا تھا''لہٰذا سورما لڑے۔ان کے قابلِ تحسین دلوں کو راحت پہنچاؤ،ان پر تلواروں سے تشدد کرو،مارو یا مر جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

اس لمحہ میں نے اپنے تاریک جسم میں ایک غیر مرئی،غیر محسوس ہجوم کو محسوس کیا۔کسی منتشر،متوازی اور بالآخر مربوط فوجوں کا ہجوم نہیں بل کہ ایک زیادہ ناقابلِ رسائی،زیادہ گہرا احتجاج جسے اُس ہجوم نے کسی طور بہت پہلے سے وضع کرلیا ہو۔ سٹیفن البرٹ بات کرتا رہا۔

''مجھے یقین نہیں ہے کہ آپ کے عالی مرتبت آباؤ اجداد نے فضول ہی ان تغیرات سے معاملہ کیا تھا۔میرے لیے یہ بات اہم نہیں ہے کہ اس نے ایک فصیح و بلیغ تجربہ کے غیر محدود نفاذ کے لیے تیس برس صرف کیے ہیں۔آپ کے ملک میں ناول،لٹریچر کی ایک ذیلی صورت ہے۔تسوئی پن کے وقتوں میں یہ

ایک سفلی صنف تھی۔ تسوئی پن ایک ذہین ناول نگار تھا۔ وہ اعلیٰ اہلیتوں کا مالک تھا۔ اس نے بلاشبہ خود کو محض ایک ناول نگار نہیں سمجھا۔ اس کے معاصرین کی توثیق اس کے مابعد الطبیعاتی اور سرّی رجحانات کی طرف اشارہ کرتی اور خود اس کی زندگی اس بات پر دال ہے۔ فلسفیانہ مناقشہ ناول کے ایک عمدہ حصے پر غالب آجاتا ہے۔ میں اس کے تمام مسائل سے آگہی رکھتا ہوں۔ کسی مسئلہ نے، وقت کے عمیق مسئلے نے اسے اتنا پریشان اور اس قدر متاثر نہ کیا۔ وقت کا مسئلہ واحد مسئلہ ہے جسے باغ کے صفحات میں شناخت نہیں کیا جا سکتا۔ حتیٰ کہ اس نے کوئی ایسا لفظ بھی استعمال نہیں کیا جو وقت کی نشان دہی کرتا ہو۔ آپ اس ارادی فروگزاشت کی کیا تصریح کریں گے؟''

میں نے چند ایک حل تجویز کیے...سب کے سب غیر تسلی بخش...ہم نے ان پر بحث کی۔ پایان کار سٹیفن البرٹ نے مجھ سے کہا،''ایک پہیلی میں، جس کا جواب 'شطرنج' ہے، کون سا واحد ممنوعہ لفظ ہوگا۔''
میں نے لمحہ بھر کے لیے تفکر کیا اور جواب دیا''شطرنج۔''

''بالکل'' البرٹ نے کہا''شاخ دار راستوں والا باغ ایک قسم کی پہیلی یا معما ہے جس کا موضوع وقت ہے۔ یہ عسیر الفہم وجہ اس کے ذکر کو ممنوع قرار دیتی ہے۔ ایک لفظ کو ہمیشہ بھول جانا، استعاروں اور واضح اشاروں کو مہمل کرنے کی طرف راجع ہونا، غالباً یہی وہ کائیاں طریقہ کار ہے جسے کج ادا تسوئی پن نے اپنے انتھک ناول کے ہر پھیر میں ترجیحاً برتا ہے۔ میں سینکڑوں مسودوں کا باہم موازنہ کر چکا ہوں۔ میں ان اغلاط کی تصحیح کر چکا ہوں جو نقل کنندوں کی غفلت سے ظہور پذیر ہوئیں۔ میں نے اس انتشار کے منصوبہ کا قیاس کیا اور اسے نئے سرے سے قائم کیا۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے از سرِ نو اساسی تنظیم کو استوار کر لیا ہے۔ میں نے تمام مسودے کا ترجمہ کیا ہے۔ مجھ پر واضح ہے کہ اُس نے ایک بار بھی وقت کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ اس کی وضاحت سہل ہے!''

''شاخ دار راستوں والا باغ نامکمل ہے لیکن نادرست نہیں ہے۔ یہ کائنات کی شبیہ ہے، جیسا تسوئی پن نے محسوس کیا۔ نیوٹن اور شوپن ہار کے برعکس آپ کے جدّ ایک یک ساں اور مطلق زبان پر اعتقاد نہیں رکھتے تھے۔ وہ زبان کے ایک غیر محدود تسلسل کے ذریعے نمو پاتی متوازن زبان کے سرگرداں جال پر اعتقاد رکھتے تھے۔ اس نظام میں زمان کے تمام امکانات موجود رہتے ہیں۔ ہم وقتوں کی ساری جمعیت میں موجود نہیں ہیں۔ کچھ میں آپ موجود ہیں اور میں نہیں ہوں اور کچھ میں میں ہوں اور آپ نہیں ہیں۔ اور کچھ میں ہم دونوں۔ لمحہ موجود میں جیسا کہ میری قسمت نے مجھے شرف یاب کیا، آپ میرے ہاں پہنچے ہیں۔ ایک دوسرے لمحے میں آپ باغ میں سے گذرتے ہوئے مجھے مردہ پاتے۔ یوں ہی ایک دوسرے

لمحے میں، میں یہ الفاظ آپ سے کہتا ہوں۔''

''ہر لمحے میں'' میں نے اعلانیہ کہا۔ میری آواز میں معمولی سی لغزش بھی نہیں تھی۔ ''میں آپ کا شکر گزار ہوں اور تسوئی پن کے باغ کی تخلیق نو پر آپ کی بڑی قدر کرتا ہوں۔''

''سب میں نہیں'' وہ ایک مسکراہٹ کے ساتھ بڑبڑایا ''زمان لاتعداد مستقبلوں کی طرف شاخ در شاخ تقسیم ہوتا چلا جاتا ہے۔ انھی میں سے کسی زمان میں میں آپ کا دشمن بھی ہوں۔''

مجھے پھر سے ہجوم کی سی کیفیت کا احساس ہوا جس کا مجھے پہلے بھی تجربہ ہوا تھا۔ مجھے یوں معلوم ہوا کہ یہ مرطوب باغ جس نے اس گھر کو گھیرا ہوا تھا، غیر محدود طور پر دکھائی نہ دینے والے لوگوں سے پُر تھا۔ وہ لوگ 'البرٹ اور میں' تھے، جو زمان کی دیگر جہتوں میں مخفی اور کثیرالانواع تھے۔ میں نے آنکھیں اوپر اٹھائیں اور یہ ڈراؤنا خواب تحلیل ہو گیا۔ زرد اور سیاہ باغ میں صرف ایک آدمی تھا۔ وہ ایک بت کی طرح مضبوط تھا۔ وہ شخص چلتا ہوا قریب آ رہا تھا اور وہ کیپٹن رچرڈ میڈن تھا۔

''مستقبل تو پہلے سے موجود ہے'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن میں آپ کا دوست ہوں، کیا میں وہ خط دوبارہ دیکھ سکتا ہوں۔''

البرٹ کھڑا ہوا۔ کھڑے کھڑے اس نے میز کا دراز کھولا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب اس کی پشت میری جانب تھی۔ میں نے ریوالور کو تھام لیا تھا۔ پھر انتہائی احتیاط کے ساتھ گولی چلائی۔ البرٹ فوراً ہی کوئی شکوہ کیے بغیر گر گیا۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ اس کی موت محض لمحہ بھر میں ہوئی۔ ایک بہت ہلکی جنبش کی طرح۔ باقی سب کچھ غیر حقیقی، غیر اہم ہے۔ میڈن اندر گھس آیا اور اس نے مجھے گرفتار کر لیا۔ میں برلن تک اس شہر کے نام کا اپنا راز ترسیل کر چکا تھا جس پر انھیں حملہ کرنا چاہیے تھا۔ کل ہی انھوں نے اس پر بم باری کی ہے۔ میں نے یہ خبر انھی اخباروں میں پڑھی ہے جن میں ایک چینی ثقافت اور زبان کے عالم البرٹ سٹیفن کے بارے میں لکھا تھا جو ایک اجنبی شخص یوسون کے ہاتھوں قتل ہوا۔ چیف نے یہ بھید پڑھ لیا۔ وہ جانتا تھا کہ میرا مسئلہ جنگ کے شور شرابے کے توسط سے اسے البرٹ نامی ایک شہر کی نشان دہی کرنا تھی اور یہ کہ میرے پاس ایسا کرنے کے لیے اسی نام کے ایک شخص کو قتل کر دینے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ لیکن وہ نہیں جانتا (نہ کوئی جان سکتا ہے) کہ مجھ پر بے حساب ندامت اور تھکاوٹ طاری ہے۔

فینفس کا مسلك

ہیلیو پولیس کو فنفس کے مسلک کا مبدا اور اس مسلک کو مصلح امینوفس چہارم کی موت سے پیدا ہونے والے مذہبی احیا کا ایک نتیجہ قرار دینے کے لیے مورخین ثبوت کے طور پر ہیروڈوٹس، ٹیسیٹس اور

مصر کے قدیم مخطوطات سے اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ لیکن وہ اس حقیقت سے صرف نظر کر جاتے ہیں یا ایسا کرنے کو ترجیح دیتے ہیں کہ یہ نام فینفس رابنس مارس سے پہلے موجود نہیں تھا۔ قدیم ترین مخطوطات میں (مثال کے طور پر فلاویس جوزیفس کی سیپٹ ئیلو میں) صرف 'دستور' یا 'راز' کے پیروکاروں کا ذکر ملتا ہے۔ گریگوروس فرار کی خفیہ مذہبی مجلس گاہوں میں ملاحظہ کر چکا تھا کہ عام گفت گو میں فینفس کا لفظ شاذ ونادر ہی استعمال کیا جاتا تھا۔ مجھے جنیوا میں ایسے دست کاروں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جو میرے یہ پوچھنے پر کہ کیا وہ فینفس کے مسلک کے پیروکار ہیں، وہ کچھ بھی نہیں سمجھ پائے۔ لیکن یہ بات انھوں نے فوراً ہی تسلیم کی کہ وہ 'راز' کے پیروکار ہیں۔ اگر وہ مجھ سے عمداً فریب نہیں کر رہے تھے تو میں کہوں گا کہ ایسا ہی معاملہ بدھ مت کے پیروکاروں کے ساتھ بھی ہے۔ وہ نام جس سے ساری دنیا انھیں شناخت کرتی ہے، دراصل ایسا لفظ ہے جسے وہ خود کبھی ادا نہیں کرتے۔

اپنے ایک بہت معروف مضمون میں ملکوشس نے فینفس کے فرقہ پرستوں کا خانہ بدوشوں سے تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ چلی اور ہنگری میں خانہ بدوش بھی ہیں اور فرقہ پرست بھی۔ ان کی اکثریت سے قطع نظر ان دونوں میں اشتراک کی حامل نہایت کم صفات موجود ہیں۔ فرقہ پرست عمومی طور پر آزاد پیشے کام یابی کے ساتھ اپناتے ہیں۔ خانہ بہ دوش خاص جسمانی ہیئت کے مالک ہوتے ہیں اور وہ ایک خفیہ زبان بولتے یا اسے بولنے کے عادی ہیں۔ فرقہ پرست دوسرے انسانوں کے ساتھ الجھاؤ کا شکار رہتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ مذہبی بنا پر مہذب ہونے کی طرف مائل نہیں ہوتے۔ خانہ بہ دوش دل آویز ہوتے ہیں اور برے شاعروں کو متاثر کرتے ہیں۔ گیت، گھٹیا تصویروں اور فوکس ٹروٹ ناچ میں فرقہ پرستوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

مارٹن بیر لکھتا ہے یہودی فطری طور پر جذبات پرست ہیں۔ سبھی فرقہ پرست تو نہیں لیکن کچھ ایسے ہیں جو جذبات پرستی پر متاسف بھی ہیں۔ یہ عمومی اور بدنام صداقت اس عمومی مغالطے کی بیخ کنی کے لیے کافی ہے (جس کا اغوا انداز میں ارمان نے دفاع کیا) کہ فینفس اسرائیل میں ظہور پذیر ہوا۔

لوگ کم وبیش اس انداز میں دلیل دیتے ہیں کہ ارمن ایک ذکی الحس انسان اور ایک یہودی تھا۔ ارمن کا پراگ میں یہودی باڑے میں فرقہ پرستوں سے مسلسل رابطہ رہا۔ وہ تعلق جس کا ارمن نے وقوف رہا، اسی حقیقت کی سچائی کو ثابت کرتا ہے۔ تمام تر احترام کے ساتھ میں اس مفروضہ سے متفق نہیں ہوسکتا۔ یہ بات کہ کسی صیہونی ماحول میں فرقہ پرست، یہودیوں سے مماثل ہیں، کچھ بھی ثابت نہیں کرتی۔ ناقابل تردید حقیقت یہ ہے کہ ہازلٹ کے لامحدود شیکسپیئر کی طرح وہ دنیا کے سبھی انسانوں سے مشابہ ہیں۔ وہ ہر

کسی کے لیے ہر شے ہو سکتے ہیں۔ جیسے ہادی ہوتا ہے۔ ایک عرصہ پہلے پیسیندو کے ڈاکٹر ہوان فرانسسکو نے ان کی اس صفت کو قابل تحسین گردانا کہ انھوں نے کس سہولت کے ساتھ کروئی اولی (Croeole) کے طور طریقوں سے مماثلت پیدا کر لی تھی۔

میں بتا چکا ہوں کہ اس مسلک کی تاریخ میں کسی مذہبی تہذیب کے آثار موجود نہیں ہیں۔ یہ سچ ہے لیکن چوں کہ کوئی ایسا انسانی گروہ موجود نہیں ہے جس میں کسی مسلک کے اراکین کی نمائندگی نہ ہو، سو یہ بھی سچ ہے کہ ضرور ایسے کسی مذہبی تشدد یا اخلاقی عذاب کا وجود ہوگا جس سے وہ متاثر ہوئے اور اس کا ارتکاب بھی کیا۔ یورپی جنگوں یا ایشیا کے دور دراز علاقوں میں لڑی جانے والی جنگوں میں انھوں نے مخالف فوجوں کے جھنڈے تلے اپنا خون بہایا لیکن اس فعل نے انھیں دنیا کی تمام اقوام کے ساتھ خود کو شناخت کروانے میں بہت معمولی معاونت کی۔

کسی مقدس کتاب کے بغیر جو انھیں یک جا کرے جیسے الہامی صحائف نے اسرائیلیوں کو کیا، کسی عمومی یادداشت کے بغیر اور ویسی کسی یادداشت کے بغیر جسے ''زبان'' کہتے ہیں، وہ دنیا کی چھاتی پر بکھرے ہوئے، اپنے رنگ اور نقوش میں مختلف ہیں لیکن صرف ایک چیز 'راز' انھیں باندھ کر رکھے ہوئے ہے اور کائنات کے اختتام تک یوں ہی یک جا رکھے گی۔ ایک زمانے میں اس راز کے علاوہ ان کے پاس ایک روایت بھی موجود تھی۔ (غالباً یہ نظریہ تخلیق سے متعلق ایک اسطورہ تھی) لیکن فینقس کے جاہل پیروکار اسے فراموش کر چکے ہیں۔ اب ان کے پاس تعزیر کی ایک مبہم روایت ہی باقی بچی ہے، ایک تعزیر یا ایک عہد نامے کی روایت۔ بیانات میں اختلاف موجود ہے۔ اس سے ہمیں خدا کے اس فیصلے کی معمولی سی رمق بھی نہیں مل پاتی جس کی رو سے وہ حیات جاوداں ودیعت کرتا رہے گا۔ ایک سلسلۂ نسب کو قائم رکھنے کے لیے نسل در نسل اس کے اراکین ایک خاص رسم ادا کرتے رہیں گے۔ میں نے سیاحوں کا موقف سنا ہے۔ میں نے بزرگوں اور ماہرین علم کلام سے مباحثے کیے ہیں۔ میں ثابت کر سکتا ہوں کہ اس رسم کی ادائی فرقہ پرستوں کی واحد مذہبی سرگرمی ہے۔ یہ رسم 'راز' پر مشتمل ہے۔ یہ 'راز' جیسا کہ میں نے پہلے اشارتاً کہا ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا رہتا ہے۔ تاہم مذہبی کتاب کے مطابق مستحسن بات یہ ہے کہ مائیں اسے اپنے بچوں کو نہ بتائیں، نہ ہی پروہت ایسا کریں۔ اس اسرار سے روشناس کرانا نیچ ذات کے لوگوں کا کام ہے، ایک غلام، ایک جذامی یا ایک گداگر روحانی استاد کی حیثیت سے کام کر سکتے ہیں۔ ایک بچہ بھی دوسرے کو عقیدے کی تعلیم دے سکتا ہے۔ یہ عمل بہ ذاتہ ادنی اور عارضی ہے۔ نہ یہاں کسی قسم کی تصریح کی ضرورت ہے۔ لوازمات میں کاک، موم یا گوند شامل ہوتی ہے۔ عشائے ربانی کی رسم میں کیچڑ کا ذکر

ہے۔اسے بھی اکثر استعمال کیا جاتا ہے۔اس مسلک کی عبادات کے لیے معبد موجود نہیں ہیں۔

راز مقدس ہے لیکن ہمیشہ کسی حد تک مضحک بھی رہا۔اس کی عبادت چھپ کر اور خفیہ انداز میں کی جاتی اور عابد کبھی اس کا تذکرہ نہیں کرتے۔اس کو نام دینے کے لیے مناسب مقدس الفاظ موجود ہی نہیں ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ تبھی الفاظ اس کے نام ہیں یا پھر ناگزیر طور پر اسے کنایتاً بیان کرتے ہیں۔سو ہو سکتا ہے کہ میں گفت گو کے دوران کوئی لفظ کہہ دوں اور اس کے پیروکار مسکرا دیں اور بے چین ہو جائیں کیوں کہ وہ محسوس کر لیتے ہیں کہ میں نے اس 'راز' کو چھو لیا ہے۔

قدیم ٹیوٹنی زبان کے ادب میں فرقہ پرستوں کی لکھی ہوئی نظمیں موجود ہیں جن کے عنوانات کا موضوع سمندر یا شام کا جھٹپٹا ہے۔وہ ایک حوالے سے اسی 'راز' کے استعارے ہیں۔میں نے یہ غیر مستند ضرب المثل "Orbi Terrarum est speculum ludi" پڑھی تھی جسے ڈیو کانگی نے اپنی قاموس میں رقم کیا ہے۔یہ اس راز کے بیان سے منع کرتی ہے۔بہت سے اراکین ان باتوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔لیکن وہ خود اپنے آپ سے کہیں زیادہ نفرت کرتے ہیں۔نیک نامی ایسے بہت سے لوگوں کا مقدر بنی جو عملاً اس رواج کا استرداد کرتے اور خدا سے براہِ راست تعلق استوار کر لیتے ہیں۔یہ فرقہ پرست اس تعلق کے اظہار کے لیے اعشائے ربانی کی رسم سے لیے گئے ہندسوں کو استعمال کرتے ہیں۔اسی لیے جان آف روڈ نے لکھا۔

''کیا سات آسمان جانتے ہیں کہ خدا اتنا خوش گوار ہے جتنی آگ اور پتلی کیچڑ''۔

میں نے تینوں براعظموں میں فینکس کے کئی پیروکاروں سے دوستانہ مراسم قائم کیے۔میں جانتا ہوں کہ 'راز' پہلے پہل انھیں پیش پا افتادہ، الجھا ہوا اور فحش معلوم ہوا اور (جو بات سب سے عجیب ہے) کہ نا قابلِ یقین بھی۔وہ خود کو یہ یقین نہیں دلا پاتے کہ ان کے والدین ایسے غیر معقول ضابطے کے اطاعت گزار تھے۔انوکھی بات یہ ہے کہ 'راز' محض کچھ عرصہ قبل ہی گم ہوا۔جنگوں اور ہجرتوں کے باوجود یہ بارعب انداز میں تمام معتقدین تک پہنچا ہے۔کوئی یہ دعویٰ کرنے سے نہیں ہچکچائے گا کہ یہ اب انسانی جبلت میں شامل ہو چکا ہے۔